اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ اَدب

مدیر راناعبدالرزاق خاں

rana_razzaq@hotmail.com

فون نمبرز۔ 02089449385 07886304637

معاون مدیر و ڈیزائنر

عامر امیر.07903126126

majeedamer20@yahoo.com

نگران ویب سائٹ، ایاز راٹھور

www.bazmesherosukhan.co.uk

ماہنامہ قندیلِ اَدب اِنٹرنیشنل مئی ۲۰۱۳ء

فہرست مضامین

ا۔غزل.....اردو شاعری کی ایک اہم صنف عاصی صحرائی۔ ''سرگنگا رام۔'' ایاز راٹھور۔ ''پریچنگ آف اسلام'' کے مصنف پروفیسر آرنلڈ راجہ منیر احمد۔۔ نئی دریافت ۔۔عامر امیر ۔نوبیل لارائیٹ ڈاکٹر عبدالسلام کی تلخیاں (زکریا ورک کنیڈا)

غزلیات، محمد علی مضطر، آدم چغتائی، مبارک صدیقی، منظر ایوبی، منظر بھوپالی، احمد فراز، پروین شاکر، خالد شریف، لطیف ساحل، سعداللہ شاہ، نوشی گیلانی، فرحت عباس شاہ، فرخ زہرا گیلانی، شہناز مزمل، شکیل سروش، قاری صادق جمیل، حمیدہ شاہین آصف جمیل، حسن عباسی، سید امتیاز احمد، سلیم گورمانی، ثناء اللہ شاہ۔نبیل احمد نبیل، راشد مراد، سعادت سعید، بخش لائلپوری، وسیم بٹ وسیم، ساحر شیوی، حنیف تمنا جرمنی، سید معراج جامی، منور احمد کنڈے، افتخار عارف، باصر سلطان کاظمی، ڈاکٹر انوار سدید، سرور سودائی، حفیظ جوہر، اسحاق ساجد، راجہ محمد یوسف،۔۔عبدالمجید ظفر

متفرقات۔انمول موتی۔غور کرنے کی بات۔لطائف و چٹکلے ماں۔جواب۔استاد شاگرد۔م زندگی کی گاڑی۔چہرے۔محبت اور شک۔پیروڈی۔**تبصرہ کتب** بخش لائلپوری کی شاعری دھنک وسیم بٹ کی کتاب۔شمع چودھری کا کلام۔**تخلیقی گداز کا مالک کالم نگار سہیل احمد۔ انور ندیم علوی کی کتاب ''ہارن دے کر فیل کریں'' سے ایک اقتباس،،** ڈاکٹر عمران مشتاق نصف ایمان (افسانچہ) رانجھے کی تلاش لطیف احمد قریشی۔روئیداد عرب (نور احمد شیخ)

وضاحت۔قندیلِ اَدب انٹرنیشنل کسی سیاسی سماجی مذہبی گروہ یا فرقے کا ترجمان نہیں یہ نسل یا فرقوں کے امتیاز سے بالاتر ہے یہ صرف ادب کی بڑھوتری کے لئے جاری کیا گیا ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں قارئین کو آراء یا مضامین سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور اس کے صفحات حاضر ہیں۔تحریر کے ساتھ اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور ارسال کریں یہ آپ کا اپنا میگزین ہے۔

قندیل ادب انٹرنیشنل کے اجراء پر میرے ادیب اور شعراء احباب کی حوصلہ افزائی کے خطوط ملاحظہ ہوں۔محترم خان بشیر احمد خان عالم دین فرماتے ہیں:۔رانا صاحب آپ نے اردو ادب کی ترویج کے لئے یہ بہت ہی اچھا اور بے لوث قدم اٹھایا ہے۔محترم ایوب اولیاء شاعر و ادیب فرماتے ہیں:۔بہت ہی مستحسن اقدام ہے۔محترم آدم چغتائی شاعر مترنم برمنگم:۔یہ اردو ادب کی خدمت ہے۔نجمہ عثمان:۔دیارِ مغرب میں آن لائن اردو کی ترویج کے لئے ایک قابلِ تحسین اقدام ہے۔منور احمد کنڈے شاعر و ادیب:۔ایک بہت اچھی کاوش ہے،مبارک ہو۔مبارک صدیقی شاعر و ادیب و اینکر:۔آپ عرقریزی اور محنت سے کام کرتے ہیں خدا تعالیٰ آپ کی کوشش کو کامیاب کرے۔سہیل لون: شاعر و ادیب و مصنف۔آپ کے کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اردو زبان سے بہت محبت ہے۔

غزل.اُردو شاعری کی ایک اہم صنف۔عاصی صحرائی

اگر یہ سوال کیا جائے کہ غزل کی تعریف کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں ہر شعر کا دوسرا مصرعہ ہم قافیہ و ردیف ہوتا ہے عام طور سے ہر شعر اپنے موضوع کے لحاظ سے دوسرے سے علیحدہ ہوتا ہے۔(ویسے مسلسل غزلیں بھی لکھی گئی ہیں) غزل کا آخری شعر مقطع ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے لیکن یہ باتیں شعر کی فارم یا ہیئت سے تعلق رکھتی ہیں اس کے مزاج اور روح کو ان کے ذریعے سمجھا نہیں جا سکتا۔ہماری شاعری میں غزل غنائیہ شاعری کا نمونہ ہے۔لیکن اس کی ترکیب میں اس کے علاوہ اور بھی عناصر شامل ہیں۔لغت نویسوں نے غزل کے معنی ''بازی کردن از جوانی و حدیث محبت، و عشق زناں'' بتائے ہیں اگر ہم کچھ دیر کے لئے غزل کو انہی معانی کا پابند بنالیں تو بھی اس کے مزاج کا اندازہ لگانے میں کچھ نہ کچھ مدد مل سکتی ہے۔''بازی کردن از جوانی'' سے ظاہر ہے کہ جذبات کی شدت اس میں ایک بنیادی عنصر ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ ''نازک ادا محبوبوں اور معشوقوں کی حدیثِ محبت و عشق میں بھی نازک ادائی اور عشق کی گرمی شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح غزل کے عناصر واضح اور متعین ہو جاتے ہیں۔غنائیت، شدت جذبات، نزاکت ادا اور سوز و گداز انہیں چار عناصر سے غزل کا خمیر اُٹھتا ہے.....حدیثِ دیگراں، اپنی حدیث

اورغمِ دوراں اپنا غم بن کر اُمنڈ پڑتا ہے لیکن غزل کا غمِ جاناں دراصل سارے غمِ دوراں کی جھلک ہے۔

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

محض شاعرانہ بات نہیں ایک حقیقت کا اعتراف اور ایک مزاج کا اظہار کہیئے؟ ''بازی کردن از جوانی'' کے علاوہ غزل کے دوسرے لغوی معانی ''بُننا'' اور ''کاتنا'' بھی ہیں غزل کے بارے میں شمس قیس رازی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرن کے پیچھے جب شکاری کتے بھاگتے ہیں اور بھاگتے بھاگتے جب ہرن عاجز آجاتا ہے تو اس وقت اس کے حلق سے جو دلدوز چیخ نکلتی ہے اسے غزل کہا جاتا ہے۔انہیں لغوی معانی کو سامنے رکھ کر کوئی غزل کی زبان پر زور دیتا ہے، کوئی موضوعات پر اور کوئی سوز و گداز پر۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل کے مزاج کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے فارسی غزل کا ایک سرسری جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ سالہا سال کے تجربہ سے جو چیزیں فارسی غزل میں داخل ہوئی ہیں وہی غزل کا مزاج بن گئی ہیں یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ چیز یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ جنس خاص ایران کی پیداوار ہے ویسے قصیدے کی صورت میں اس کا وجود عرب میں بھی مل جاتا ہے لیکن مستقل شکل غزل کو ایران نے ہی عطا کی عرب میں بعض اوقات قصیدے کی تشبیب میں غزل کے مضامین بیان کئے جاتے تھے۔ایران میں بھی عربوں کے زیر اثر ایک عرصے تک قصیدے کا رواج رہا۔ فارسی غزل کا باقاعدہ رواج سامانی دور سے ہوتا ہے اس دور کی شاعری کو خراسانی دبستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔خراسانی دبستان کی غزل گوئی کی خصوصیت جذبات سادہ کا اظہار ہے اس وقت غزل چونکہ جذباتی موضوعات تک محدود تھی اس لئے اس کی زبان بھی جذباتی ہے۔یہیں سے فارسی غزل کی بنیاد پڑتی ہے اور اس وقت سے یہ روایت قائم ہوگئی کہ غزل کے لئے موضوع خواہ کسی قسم کا منتخب کیا جائے لیکن اس کی زبان اور فضاء عشقیہ اور جذباتی ہی ہونی چاہیئے۔ غزل کی ترقی کا زمانہ تصوف کا زمانہ ہے تصوف کی ابتداء اگرچہ تیسری صدی کے آغاز سے ہوتی ہے۔لیکن پانچویں صدی میں اسے عروج حاصل ہوا اور یہی غزل کی ترقی کا پہلا دور ہے۔دبستان عراق کے غزل گو شعراء میں پہلا نام حکیم سنائی کا اور آخری نام مولانا رومؒ کا ہے۔حکیم سنائی نے غزل کو خوب ترقی دی تخلص کا رواج بھی غزل کے مقطع میں سب سے پہلے ان کے ہاں ہی پایا جاتا ہے۔وارداتِ حقیقت کو مجاز کی زبان سے ادا کرنا حکیم سنائی سے ہی شروع ہوتا ہے عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں اوحدی مراغی نے غزل کو جذبات سے لبریز کر دیا اور اس کے ساتھ زبان کی روانی، سلاست، صفائی اور نزاکت بھی پیدا کی۔اس دور کا شاندار کارنامہ مولانا رومؒ کا ہے اُن کے کلام میں والہانہ مستی پائی جاتی ہے یہ لوگ باعمل صوفی تھے۔جو وارداتِ قلبی پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے لیکن اس دور کی غزل محض مجازی عشق کے اظہار کا وسیلہ ہی نہ رہی اب گل و بلبل کے پیمانے میں مسائل تصوف بھی بیان ہونے لگے تھے یہیں سے غزل میں علامتوں کا استعمال شروع ہوتا ہے۔منگولوں کے بعد جو دور آتا ہے اسے شیرازی دبستان کہا جاتا ہے اس زمانہ میں ایران میں سیاسی ابتری پھیل گئی اور یہ خیال عام ہوگیا کہ زندگی بسر کرنے کی چیز نہیں ہے حالات کے زیر اثر غزل میں بھی ایک المیہ فضا پیدا ہوگئی یہی وجہ ہے کہ اس دور کی غزل میں سوز و گداز کا عنصر نمایاں ہے اس مرحلہ پر تصوف کو اور زیادہ ترقی ہوئی۔غزل کی عشقیہ زبان جو ابتداء میں ہی بن چکی تھی اسے قائم رکھتے ہوئے تصوف کو زیادہ وسعت دی گئی اس وقت شعر و شاعری سے دلچسپی لینے والا دو قسم کا طبقہ تھا ایک وہ جو عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور دوسرا وہ جو تصوف کا حامی تھا۔اس لئے ایسی شاعری نے جنم لیا جس میں دونوں قسم کے جذبات کی ترجمانی تھی کہ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق لطف اُٹھا سکے اس لئے بعض اصطلاحات سے کام لیا گیا ان اصطلاحات نے غزل میں جان ڈال دی سعدی اور حافظ اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں حافظؔ نے غزل کو بہت ترقی دی انہوں نے غزل میں اخلاق، فلسفہ، پند و موعظت، سیاست غرض ہر قسم کے مضامین بیان کی ء ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی غزل کی خاص زبان اور اس کے جو شیرینی، رعنائی اور رنگینی درکار ہے ،اسے قائم رکھا، ہر قسم کے دقیق خیالات ان کی غزل میں آکر رنگین بن جاتے ہیں بقول عرفی۔

درد دل ما غم دنیا ، غم معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہء ما

فارسی غزل کے ان ادوار کو سامنے رکھ کر غزل کے اجزاء کا اندازہ ہوسکتا ہے ا۔غزل کا بنیادی موضوع، عشق و عاشقی کے جذبات ہیں۔۲۔اہ ایک داخلی صنف سخن ہے، اس میں واردات قلبی کا بیان ضروری ہے۔۳۔اس کی زبان سادہ اور صاف، نرم و شیریں اور شگفتہ ہونی چاہیئے ۔۴۔سوز و گداز غزل کے بنیادی عناصر میں سے ہے ۔۵۔دوسرے موضوعات بھی غزل کی زبان میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔۶۔علامات اور اصطلاحات کا استعمال غزل کی زبان کا لازمی جزو ہے۔فارسی کے زیر اثر غزل اردو میں داخل ہوئی ہے اور اس کے ساتھ فارسی غزل کی یہ روایات اردو غزل میں رواج پذیر ہوتی ہیں غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔اسی لئے رشید صدیقی نے اسے اردو کی آبرو کہا ہے۔ان کے خیال میں غزل ہماری تہذیب اور تہذیب ہماری غزل میں ڈھلی ہے اگر امیر خسروؒ سے شروع کی جائے تو غزل کی روایت چھ سو سال پرانی ہے اور ہر دور کی تہذیب کی جھلکیاں ہماری غزل میں نظر آتی ہیں۔اردو شاعری کے متعلق جوشؔ صاحب کا یہ کہنا ہے کہ۔

رنگ و بو آب و نمک نور و ضیا کچھ بھی نہیں
چند نرم و گرم غزلوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مخفی تعصب کی بنا پر ہے۔ہندوستان میں غزل نے وہ مرتبہ حاصل کیا جو کم ہی کسی اور

صنف کو حاصل ہوا ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہندوستان کا ماحول غزل کے لئے بہت سازگار رہا ہے بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:۔غزل ہمارے مخصوص ماحول کی پیداوار ہے اور ہمارا مخصوص ماحول غزل کی پیداوار

''سرگنگارام نے ہندومت کی فرسودہ رسموں سے بغاوت کی'' ایاز راٹھور

سرگنگارام شمالی ہندوستان سے پنجاب میں آکر آباد ہوئے تھے۔سرگنگارام پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں نکانہ صاحب میں پیدا ہوئے۔ایک طرف وہ پروفیشنل تھے ۔وہ ایک سول میکینیکل انجنیر آبپاشی تھے۔دوسری طرف ان کی اصلاحات تھیں جو وہ بدلتے ہوئے حالات میں برّصغیر کے اندر کر رہے تھے۔انہوں نے سرمایہ دار ہونے کے ناطے جو بھی دولت کمائی وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کر دی۔لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ترغیب اور سہارا بھی دیتے تھے۔انہوں نے بہت سی عمارات کی ڈیزائننگ بھی کی۔جن میں گورنمنٹ کالج لاہور، عجائب گھر، ایچی سن کالج لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، دیگر مال روڈ کی عمارات جن میں ڈنگا سنگھ بلڈنگ وغیرہ ان کی ڈیزائن کردہ اور طرز تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔انہوں نے اپنا پہلا بنگلہ بنایا جس میں ہیلے کالج آف کامرس قائم ہوا۔اس عمارت کو انہوں نے خود وقف کیا۔مزنگ میں زمین خرید کر اس میں ڈسپنسری بنائی اور پھر اس میں سرگنگارام ہسپتال بنایا۔جو آج تک دکھی انسانیت کی خدمت پر مامور ہے۔ماڈل ٹاؤن بننے سے قبل اس کی پلاننگ سرگنگارام نے کی تھی۔پنجاب کی نہریں، اپر چناب اور لوئر چناب کی ڈیزائننگ بھی آپ نے کی تھی ۔وہ انگریزی دور میں پہلے غیر انگریز چیف انجنیر پنجاب تھے۔ان کی بہتر کارکردگی پر ان کو ''سر'' کا خطاب ملا تھا۔سرگنگارام ایک روشن خیال انسان تھے۔اس لئے انہوں ایک دوسرا بڑا کارنامہ اپنے دھرم کے خلاف کیا کہ جو ہندو خواتین بیوہ ہو جاتی تھیں انہیں ہندو مذہب کے مطابق دوبارہ شادی کا حق نہ تھا۔سرگنگارام نے اس فرسودہ رسم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور پنڈتوں کے خلاف ڈٹ گئے اور ''وڈو میرج ایسوسی ایشن'' بنا ڈالی اور بیوگان کو معاشرے میں اعلیٰ مقام دلوایا۔وہ ہندوؤں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو سادھوؤں اور درویشوں کو مانتے ہیں وہ انتہا پسندی کے خلاف اور برداشت کے قائل تھے (سرگنگارام صحرا کی فصل)

''پریچنگ آف اسلام'' کے مصنف پروفیسر آرنلڈ راجہ منیر احمد

پروفیسر آرنلڈ ایک یورپی تھے۔جو کیمرج سے فلسفہ کی ڈگری لے کر سب سے پہلے علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے۔اس کے ساتھ وہ فارسہ، عربی، سنسکرت اور اردو کے بھی ماہر تھے۔ان کے علاوہ فرانسیسی، لاطینی، اور انگریزی پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔انہوں نے دس سال تدریسی فرائض انجام دیئے۔۱۹۹۸ء میں لاہور چلے آئے۔ یہیں اقبالؔ پر اُن کے تاثرات ہوئے۔پروفیسر آرنلڈ بہت اسلام دوست تھے۔ علیگڑھ میں قیام کے دوران انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔لیکن ان میں تنگ نظری یا تعصب کو بالکل نہ تھا۔وہ ایک انصاف پسند محقق تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب سر ولیم میور نے اپنی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں آنحضرتؐ کی زندگی پر اعتراض کئے تو پروفیسر آرنلڈ نے ان کا جواب دیا۔عیسائیوں کے اس اعتراض پر کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تو انہوں نے ''پریچنگ آف اسلام'' جیسی عظیم کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ اسلام تلوار کی بجائے تبلیغ سے پھیلا ہے یہ کتاب اسقدر ٹھوس دلائل پر مبنی تھی کہ اس کے بعد کسی کو یہ جرات نہ ہو سکی۔پروفیسر آرنلڈ کے مسلم راہنماؤں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔وہ ایک انسان دوست ملنسار انسان تھے۔سرسید احمد خاں پروفیسر آرنلڈ کو اپنے قریبی دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ان کے تعلقات شبلی نعمانی کے ساتھ بھی بہت گہرے تھے۔آرنلڈ نے شاگردوں کی حیثیت سے زبانوں کا مطالعہ کیا ۔پروفیسر آرنلڈ نے ایک ''انجمن اخوان الصفاء'' کے نام سے قائم کی جس میں وہ عربی لباس پہن کر جایا کرتے تھے۔انسان دوستی ہی کے باعث جب وہ انگلستان جانے لگے تو الطاف حسین حالؔی نے ان کے اعزاز میں ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا۔جس میں بڑے پیار، محبت اور انس کا اظہار کیا گیا۔علامہ اقبالؔ سے ان کو اس قدر محبت تھی کہ انہیں اپنا دوست خیال کرتے تھے۔پروفیسر آرنلڈ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔جو زندگی بھر قائم رہا۔علامہ شبلی نے اپنے سفرنامہ شام و مصر و روم میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جب وہ اپنے جہاز میں سوار تھے۔علامہ شبلیؒ دوڑے دوڑے پروفیسر آرنلڈ کے پاس پہنچے تو انہیں مطالعہ میں غرق پایا۔پروفیسر آرنلڈ کو جھنجھوڑا اور بتایا کہ جہاز ڈوبنے والا ہے۔اور آپ آرام سے مطالعہ میں مصروف ہیں۔اس پر پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا.....''میں انجن کے بارے میں بخوبی واقف ہوں۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی کے آخری لمحات بھی مطالعہ میں صرف ہوں''۔

نئی دریافت ۔۔عامر امیر

دنیا میں آج جتنی تحقیق کی آڑ میں کھوج، ٹوہ اور جستجو ہو رہی ہے۔اتنی شاید ہی کسی دور میں ہوئی ہو۔مگر اس کے باوجود مادے کی چوتھی قسم دریافت نہیں کر پائے۔جی ہاں! ابھی تک وہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔کہتے ہیں کہ مادے کی تین اقسام ہیں۔ٹھوس، مائع، گیس حالانکہ اس کی چوتھی قسم بھی ہے۔جسے ''صنفِ نازک بھی کہا جاتا ہے۔جس کے آنسو مائع ہیں۔جس کی شخصیت ٹھوس اور جو اس سے ٹکرا جائے وہ گیس بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔یہ دریافت اتنی اعلیٰ ہے کہ اس کے بارے میں بڑے بڑے دانشور اپنے مقالات تشنہ پاتے ہیں۔اور بعض لوگ ان دریافتوں پر ٹھٹھک رہے ہیں۔ان کی سوچوں تک میں ''میں نہ مانوں'' تک کی تیوریاں حائل ہیں۔جبکہ صنفِ نازک کسی مقام سے بھی گزر جائیں نہ وہ تھکتی ہیں اور نہ وہ ٹھٹھکتی ہیں۔ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ بھٹکتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور راہِ حیات گزر جاتی ہے۔تعلیم یافتہ لوگ سحر، جادو ٹونے پر یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ان چکروں میں پڑتے ہیں۔ظاہر ہے کہ اس تیز

رفتار زمانے میں ان کے پاس اتنی فرصت کہاں۔مگر عورت کی باتوں میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولا ہے کہ اکثر خواتین مردوں پر چڑھی رہتی ہیں کہ بہت سوں کے مکانات، فلیٹس اوپر کی منزل پر بنے ہوتے ہیں۔(جہاں وہ بہت خوش رہتی ہیں) عورت کا جادو اکثر مرد کی زبان پر بھی اتر جاتا ہے۔جب ہی تو خاندانی جھگڑوں میں بڑی بوڑھیاں اپنے نافرمان بیٹوں کی سرزنش کرتے ہوئے اکثر کہتی ہیں۔"ارے یہ تو نہیں بول رہا یہ وہ ڈائن بول رہی ہے جس کی زبان تیرے منہ میں آگئی ہے۔کم بخت نے جادو کر دیا ہے۔جو وہ کہتی ہے وہی تو کرتا ہے۔تیری عقل کو تو کا گالے گیا کہ اسی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اسی کے کانوں سے سنتا ہے۔(کرلوگل) عورت ایسی طاقت ہے کہ جسے دیکھ کر گھگھی بھی بندھ جاتی ہے۔(جب وہ بغیر میک اپ کے سر جھاڑ اور منہ پھاڑ سامنے آجائے) اور دیکھ کر دوسرا جامد بھی ہو جاتا ہے۔جب وہ تیس چالیس سنگھار کر کے آجائے۔،جی ہاں بالوں کے سٹائل ،میک اپ کے سٹائل ، ملبوسات کی قیامتیں،ڈریس ڈیزائن کے نام پر کمر پر کھڑکیاں اور دروازوں جیسے پھاٹک کسی کسائی ڈوریاں،زیورات کی بہتات اتنی کہ ناف تک پر بڑا سا گلو بند کسا ہوا۔ساڑھی کی دائیں جانب جہاں جسم اور ساڑھی کا رشتہ ٹوٹ رہا ہو وہاں جھومر جیسا زیور اٹکا ہوا۔ اتنے سارے لوازمات جب ایک ساتھ ملکر دھاوا بول دیں،فرد تو کیا انجمن کی انجمنیں پاگل ہوسکتی ہیں اور ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ کرسکتی ہیں کہ جب کچھ سمجھ میں نہ آئے اور کوئی کچھ کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔تو ایسے میں ہوتا یہی ہے کہ:۔جیا گائے تارارارارم۔یوں تو دنیا میں خوبصورت پھول خوبصورت اشیاء ہیں مگر ان سب پر عورت کی خوبصورتی ہمیشہ نمایاں رہی ہے تاریخ شاہد ہے کہ کہ دنیا کی بڑی بڑی بدصورت لڑائیاں اسی خوبصورتی کی وجہ سے بھی ہوئیں،شہنشاہوں نے راج پاٹ چھوڑ دیئے شاعر پاگل ہوگئے فلم سازوں نے اپنی گھریلو لائف تباہ کرلی۔کہ خوبصورتی ہمیشہ ہیروئن کی طرح نشہ دیتی ہے۔اور تباہ کر دیتی ہے گھریلو عورتوں نے بہتیرا سمجھایا کہ خوبصورت عورت اگر بد مزاج ہو تو وہ بہت بدصورت ہوتی ہے مگر مردوں کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی اور انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ خدا جب حسن دیتا ہے" نزاکت آہی جاتی ہے"۔یہ نزاکت بدمزاجی کے خول میں ہو یا غرور کے کیپسول میں اسے کوئی نظر انداز نہیں کرتا۔اس دکھ بھرے حقائق کو دیکھتے ہوئے ہم ایک نئی دریافت کرنا چاہ رہے ہیں۔مورخ اور اہل دل نوٹ کرلیں کہ عورت کے لفظی اور معنوی معنیٰ" کنوئیں" کے ہیں۔یہ کنواں ٹھنڈا اور میٹھا بھی ہوتا ہے اور اندھا بھی کہ جب عورت ماں ہوتی ہے تو اپنی ممتا سے تسکین پہنچاتی ہے اور جب وہ بیوی ہوتی ہے تو اس کی محبت،اس کی وفاداریاں کنوئیں جیسی گہری ہوتی ہیں اور جب کوئی مرد ان تین رشتوں کے علاوہ اس کو سمجھنا چاہے مکروفریب کے جال ڈال کر اسے شیشے میں اتارنا چاہے تو وہ یہ سمجھ لے کہ وہ کسی اندھے کنوئیں میں تو گر سکتا ہے مگر اس کی پیاس نہیں بجھ سکتی کہ" عورت" تمام خوبصورتیوں اور تمام بدصورتیوں سے ماورئی ہے۔کہ اس کا مقام بہت بلند ہ یسے گرنا چاہیئے اور نہ ہی کسی کو گرانا چاہیئے کہ وہ ہر گھر کا ایک مضبوط ستون ہے۔جی ہاں۔(ماخوذ)

نوبیل لارائیٹ ڈاکٹر عبدالسلام کی تلخیاں

زکریا ورک (کینیڈا)

انسان چھوٹا ہو یا بڑا، ہر ایک کو زندگی میں تلخیوں اور مایوسیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔مایوسیاں کبھی ملازمت میں، کبھی رشتوں میں، کبھی بزنس میں پیش آتیں۔ مایوسیوں ،حادثوں اور ناکامیوں سے عقل مند انسان سبق سیکھتا اور ان کو پیش قدمی کا ذریعہ بناتا ہے۔آئن سٹائین کو بھی زندگی میں متعدد ناکامیوں سے واسطہ پڑا تھا۔یہاں ہم عصر حاضر کے ایک اور جلیل القدر سائنسدان کی مایوسیوں کا ذکر کریں گے۔

فزکس میں آج تک ایک ہی مسلمان نے نوبل انعام جیتا ہے اور اس کا نام ڈاکٹر عبدالسلام تھا۔ڈاکٹر سلام کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی، ابتدائی تعلیم پاکستان میں مگر وفات انگلستان میں ہوئی تھی جہاں وہ 44 سال سے مقیم تھے۔عبدالسلام سائنسدان کا دماغ رکھتے، دل شاعر کا اور شخصیت درویش صفت انسان کی تھی۔نوبل انعام میں شریک سائنسدان شیلڈن گلاشو کے بقول سلام: *نہایت مہربان، مشفق اور جن لوگوں سے میں آج تک ملا ہوں ان میں سے مہربان ترین انسان تھا*۔ڈاکٹر سلام کی زندگی کے کئی رخ، اور تمام اوصاف کریمانہ کے مالک تھے۔ان اوصاف میں سے کئی ایک تو ان کیلئے عزت ورحمت کا موجب ثابت ہوئے جبکہ چند ایک باعث تکلیف ثابت ہوئے۔ان کو زندگی میں متعدد مایوسیوں اور حادثوں سے دوچار ہونا پڑا جن میں سے سب سے بڑا حادثہ یہ تھا کہ وہ پاکستان سے بے لوث محبت کرتے تھے مگر پاکستان نے ان سے بے لوث محبت نہ کی۔ وہ مسلمانوں کے بھی ہمدرد اور خیر خواہ تھے مگر بنیاد پرست مسلمان ان کی مذہبی عقائد کی بناء پر ان سے سخت متنفر تھے۔زندگی کے آخری ایام میں جب وہ کافی کمزور ہو چکے تھے، وہ ایک اعصابی بیماری PSP کی وجہ سے چلنے سے محروم، بے دست وپا ہو کر اکثر وقت وہیل چیئر میں گزارتے تھے۔ان دنوں پاکستان کی یاد ان کو بہت ستاتی تھی، وہ خود کو ایک ٹھکرائے جانیوالے عاشق کی طرح محسوس کرتے تھے۔اس کا اظہار اس پیغام سے ہوتا ہے جو انہوں نے کراچی میں ہونیوالی *سلام یادگاری کانفرنس* کیلئے بھیجا تھا۔

جب ہم ڈاکٹر سلام کے پاکستان سے عشق کا غور سے مطالعہ کرتے تو پتہ چلتا کہ اس تعلق میں ان کو بہت سارے اتار چڑھاؤ دیکھنا پڑے۔اور جتنا آپ نے اس تعلق کو سدھارنے کی کوشش کی یہ اتنا ہی بگڑتا گیا۔اس کی پہلی مثال 1951ء کی ہے جب آپ برطانیہ سے پوسٹ گریجوایٹ کرنے کے بعد لاہور واپس آئے تا سائنس دان کے بطور اپنے وطن کی خدمت کر کے اخلاقی قرض اتار سکیں۔سلام نوجوان نسل کی ایجوکیشن اور ریسرچ پر مکمل یقین رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستان کی یونیورسٹیاں اور

حکومت ان کے جنون passion کو سپورٹ کریں تا ملک میں سائنسی تعلیم کا رواج عام ہو سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ نوجوان نسل میں ریسرچ کی روح پھونک سکیں تا سائنسی تعلیم کے ذریعہ پاکستانی معاشرہ کو جدید بنایا جا سکے۔ گورنمنٹ کالج میں بجائے اس کے کہ ان کے زیر نگرانی مزید سائنسدان تعلیم پاتے ان کو فٹ بال ٹیم کا نگران بنا دیا گیا تھا۔ سائنس کی تعلیم کے محض تین طالب عالم خواہش مند تھے جن میں سے دو بھائی ریاض الدین اور فیاض الدین تھے جو بعد میں عالمی مرتبہ کے سائنسدان ثابت ہوئے۔ متعدد فریادوں، درخواستوں کے باوجود جب سلام اس جانب کسی طرف سے سپورٹ حاصل نہ کر سکے تو بہت بددل ہوئے اور لاہور میں تین سال کے قیام کے بعد وہ کیمبرج لیکچرار بن کر واپس آ گئے۔

مایوسی کی تیسری مثال یہ ہے کہ ڈاکٹر سلام لاہور میں نظری طبیعات کا مرکز قائم کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب حکومت نے ان کو مالی یا اخلاقی معاونت دینے سے انکار کر دیا تو وہ بہت بددل ہوئے۔ صدر پاکستان نے اپنے وزیر خزانہ سے جب اس بارے میں مشورہ کیا تو محمد شعیب نے جواب دیا: جناب صدر، پروفیسر صاحب پاکستان میں سائنسدانوں کیلئے فائیو سٹار ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر سلام نے شکست تسلیم نہ کی اور مغربی حکومتوں خاص طور پر اٹلی کی حکومت کی مدد سے 1964ء میں وہ ٹریسٹ میں ایسا عالمی مرکز قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ طرفہ یہ کہ اس سینٹر سے سب سے زیادہ تربیت پاکستانی سائنسدانوں نے حاصل کی ہے اور کر رہے ہیں۔

مایوسی کی چوتھی مثال 1974ء کی ہے جب احمدیوں کو پاکستان میں آئینی طور پر غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ سلام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کے فرقہ کو انسانی حقوق سے محروم کر کے اپنے وطن میں ہی اقلیت قرار دے دیا جائیگا۔ اس واقعہ کے بعد ان کا دل پاش پاش ہو گیا اور انہوں نے صدر پاکستان کے سائنسی مشیر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نامسعود واقعہ نے سلام کو جذباتی طور پر گہرے رنگ میں متاثر کیا اور انہوں نے اپنے چہرہ کو داڑھی سے مزین کر کے اپنے نام میں محمد کا اضافہ کر دیا تا ان کی مذہبی شناخت برقرار رہے۔ ایک سیاسی فیصلہ ان کی spiritual enlightenment پر منتج ہوا تھا۔

پانچواں جانکاہ حادثہ 1979ء میں پیش آیا جب سلام کو نوبل انعام ملنے کے بعد پاکستان لیکچر دینے کیلئے مدعو کیا گیا تھا۔ طالب علموں کی طرف سے اس کے خلاف ردعمل دیکھ کر ان کو صدمہ ہوا۔ ملتان میں ایک مذہبی جماعت کی طلباء کی تنظیم نے اس قدر خوفناک مظاہرہ کیا کہ سلام کا لیکچر منسوخ کر دیا گیا کیونکہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار کو سلام کی زندگی پر حملے کا احساس ہو گیا تھا۔ یہ کتنے الم و حزن کی بات ہے کہ جتنا سلام نے کوشش کی کہ وہ پاکستان میں سائنسی کوششوں میں ممد ثابت ہوں تا کہ طالب علم ان سے انسپریشن حاصل کر سکیں، اتنا ہی زیادہ طالب علموں نے منفی ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ پروفیسر ہود بھائی اپنے تجربہ کے بارے میں رقم طراز ہیں: "سلام نے قائداعظم یونیورسٹی کو کبھی وزٹ نہیں کیا جہاں میں 1973ء سے تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چوائس ہماری فیکلٹی کا نہیں تھا۔ 1979ء میں جب سلام کو نوبل انعام دیا گیا فزکس فیکلٹی کے متعدد ممبران یونیورسٹی میں سمپوزیم کیلئے ان کو بلانا چاہتے تھے لیکن ایک بنیاد پرست سیاسی جماعت کے طالبعلموں نے اعلان کر دیا کہ وہ ایسی ہونیوالی میٹنگ میں گڑبڑ کریں گے۔ چنانچہ دعوت نامہ واپس لے لیا گیا۔ طالب علموں کی اس تنظیم اور اس کی جڑی مذہبی جماعت سلام کو کافر گردانتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق احمدیہ فرقہ سے ہے"۔

ڈاکٹر سلام کے ساتھ چھٹا المناک حادثہ تب پیش آیا جب پنجاب کی منسٹری آف ایجوکیشن نے فیصلہ کیا کہ سلام کا نام جماعت نہم اور دہم کی طبیعات کی کتاب سے خارج کر دیا جائے۔ بنیاد پرست طالب علموں کے ایک تشدد پسند گروہ نے مطالبہ کیا کہ سائنس کی کتابوں سے سلام کا نام درج ہی کرنا ہے تو اس کو غیر مسلموں کیساتھ لکھا جائے تا مسلم طلباء کو دھوکہ نہ دیا جا سکے۔ منسٹر آف ایجوکیشن اس دھمکی سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس نے چیئرمین ٹیکسٹ بورڈ کو حکم صادر کر دیا کہ سلام کا نام مسلمان سائنسدانوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ طالب علموں کے مطالبہ سے وزیر تعلیم نصاب میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

سلام کی ساتویں اور آٹھویں مایوسی کا تعلق عالمی سیاست سے ہے۔ ڈاکٹر سلام نے یونیسکو کا ڈائریکٹر جنرل بننے کیلئے سرتوڑ کوشش کی تھی۔ 1987ء میں اس ضمن میں انہوں نے 30 ملکوں کا دورہ کیا تھا۔ اگرچہ آپ کے پاس پاکستانی شہریت تھی مگر جنرل ضیاء الحق کی حکومت جنرل یعقوب علی خاں کو نامزد کر چکی تھی جو ایک وقت وزیر خارجہ رہ چکا تھا۔ یعقوب خاں کے حق میں لابی انگ کا کام عطیہ عنایت اللہ کر رہی تھی جس نے کہا تھا کہ جس طرح ایک جنرل نے فرانس کو بچایا تھا اسی طرح ایک اور جنرل یونیسکو کو بچائے گا۔ سلام نے وزیر اعظم محمد خاں جونیجو کو تجویز کیا کہ ڈائریکٹر جنرل کیلئے پاکستان کے دو امیدوار ہونے چاہئیں۔ لیکن جونیجو کو معلوم تھا کہ ضیاء الحق اس تجویز سے اتفاق نہیں کرے گا اسلئے اس نے شش و پنج سے کام لیا۔ سلام کیلئے یہ شکست نہ صرف ان کی زندگی میں ٹرننگ پوائنٹ بلکہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ ان کی امنگیں پاش پاش ہو چکی تھیں۔ مگر جو لوگ سلام کے قریبی واقف کار تھے انہوں نے سکھ کا سانس لیا کہ ایک چھوٹے سے انسٹی ٹیوٹ کو چلانا جہاں سلام ہر ایک کے نام سے واقف تھا مگر یونیسکو کو روزانہ چند گھنٹے دے کر چلانا آسان کام نہیں تھا۔

برطانیہ میں سلام ایک مرعوب و مسحور کن شخصیت تھے۔ انہی دنوں میں سلام اور پال میتھیوز نے "برٹش نیشنل تھیوریٹکل فزکس سینٹر" کا تفصیلی آرکیٹیکٹ پلان تیار کیا جس کو امپریل کالج کے اندر تعمیر ہونا تھا۔ مگر یہ سکیم بھی ناکام ہو گئی کیونکہ برٹش سائنٹفک

کمیونٹی نے اس کی حمایت نہ کی۔ 1981ء کا سال جیمز کلرک میکس ویل کی پیدائش کا 150 سال تھا جو نیوٹن کے بعد برطانیہ کا سب سے عظیم سائنسدان تھا مگر اس کو قومی طور پر کوئی تشخص نہیں دیا جاتا تھا۔ برطانیہ میں سلام ان چند افراد میں سے تھا جس نے میکس ویل کو یاد رکھا اور کوشش کی کہ یوم پیدائش قومی سطح پر منایا جائے۔ مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی البتہ اس کا جنم دن سوویٹ یونین میں منایا گیا تھا۔

نیوکلیئر پروگرام۔

پاکستان نے نیوکلیئر پروگرام میں ڈاکٹر سلام نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے ملک میں نیوکلیئر ریسرچ انسٹی ٹیوٹس PINSTECH کی بنیاد رکھی تھی۔ سلام کو انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی IAEA میں پاکستانی وفد کا سربراہ 1964ء میں مقرر کیا گیا تھا۔ یہ اعزاز آپ کو دس سال تک حاصل رہا تھا۔ 1965 میں کینیڈا اور پاکستان کے درمیان ایٹمی تعاون کا معاہدہ ڈاکٹر سلام کی کوششوں سے طے پایا تھا۔ اسی سال کراچی میں نیوکلیئر پاور پلانٹ کے پلوٹونیم ری ایکٹر نے کرٹیکل درجہ حاصل کیا تھا۔ 1972ء میں حکومت پاکستان کو ہندوستان کے نیوکلیئر پروگرام کی اطلاع ملی تھی۔ اس کے فوراً بعد وزیراعظم بھٹو نے نیوکلیئر سائنسدانوں اور انجنیئرز کے ایک گروپ کو تشکیل دیا جس کے سربراہ ڈاکٹر سلام تھے۔۔ 1972ء میں جب سلام صدر پاکستان کے سائنسی مشیر تھے تو انہوں نے نیوکلیئر سائنسدانوں کی مسٹر بھٹو کیساتھ ملتان میں خفیہ میٹنگ کا انتظام کیا۔ اس میٹنگ کے چند ماہ بعد سلام، ڈاکٹر منیر احمد خاں اور ڈاکٹر ریاض الدین مسٹر بھٹو سے ان کی قیام گاہ پر ملے جہاں انہوں نے سربراہ مملکت کو جملہ امور سے آگاہ کیا۔ اسکے بعد منیر احمد خاں اور سلام کو نیوکلیئر ویپن پروگرام کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اس عرصہ میں سلام نے تھیورٹیکل فزکس گروپ کو بھی تشکیل دے دیا تھا جس نے ایٹمی بم کا تھیورٹیکل ڈیزائن تیار کیا تھا۔ یہ تھیورٹیکل ڈیزائن سلام کے شاگرد پروفیسر ریاض الدین کی سرکردگی میں 1977ء میں مکمل ہوا تھا۔

مذہبی لیڈر اس بات پر خوش نہیں تھے اسلئے انہوں نے شوشہ چھیڑ دیا کہ سلام پاکستان کے نیوکلیائی راز غیر ممالک کو سمگل کر رہے ہیں۔ روزنامہ پاکستان کے اصغر علی گھرال نے اس بارہ میں اپنے کالم میں لکھا تھا: کہتے ہیں ایک بستی سے درزی اچانک بھاگ گیا بستی میں کہرام مچ گیا۔ کسی کے سوٹ کا کپڑا لے گیا اور کسی کی شیروانی کا۔ کوئی عورت اپنے غرارے کو رو رہی تھی اور کوئی شلوار قمیض کو۔ لیکن ان سب سے زیادہ اونچی آواز میں میراثی رو رہا تھا۔ کسی سے میراثی سے پوچھا: تمہارا کیا نقصان ہوا ہے؟ ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے انکشاف کیا: ظالم میرا ناپ لے گیا (اسلام یا ملا ازم صفحہ ۱۴۵)۔ اسکے برخلاف ایک گروپ ایسا تھا جو ان کو فادر آف نیوکلیئر پروگرام کہہ رہا تھا۔ راقم الحروف نے 1982ء میں امریکہ میں ملاقات کے دوران ان کو بتلایا تھا کہ امریکہ کے اخبارات (انڈیا ابراڈ، نیویارک ٹائمز) کے آرٹیکلز میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ آپ پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام میں مدد کر رہے ہیں۔ میرے استفسار پر آپ مسکرادئے اور ایک منجھے ہوئے ڈپلومیٹ کیطرح جواب دیا:

It is a double edge sword.

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سلام امن پسند انسان تھے، وہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے خلاف تھے۔ 1974ء کے بعد تو حکومت پاکستان کیساتھ تمام عملی تعاون ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ آج پاکستان میں کوئی بھی ان کو نیوکلیئر پروگرام شروع کرنے کا کریڈٹ دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو حقائق سے انکار ممکن نہیں۔ سلام امن پسند اغراض (بجلی کی پیداوار) نیز ترقی کیلئے ایٹمی قوت بنانے کے حق میں ضرور تھے۔

ان مایوسیوں کے باوجود ڈاکٹر سلام کو عالمی شہرت میں نمایاں مقام حاصل ہے اور رہیگا۔ سوئزرلینڈ، کینیڈا، پاکستان میں ان کے نام سے سڑکیں، تعلیمی ادارے منسوب ہیں۔ اٹلی میں آئی سی ٹی پی International Centre for Theoretical Physics, Trieste کا ادارہ ان کے نام کی پہچان ہے۔ لاہور میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے فزکس ڈی پارٹمنٹ میں سلام چیئر قائم ہو چکی ہے جس کے حامل ڈاکٹر غلام مرتضی ہیں۔ اسی طرح نیو مسلم ٹاؤن لاہور میں عبدالسلام سکول آف میتھے میٹکل سائنسز گزشتہ آٹھ سالوں سے کام کر رہا ہے۔ جو کام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مسلمانان ہند کی شناخت اور تربیت کیلئے کیا تھا وہی کام آئی سی ٹی پی غریب اور ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کی تربیت میں کر رہا ہے۔ عبدالسلام ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارے، ایک منصوبے، ایک تحریک، ایک تعلیمی گہوارے کا نام تھا۔ شاہ جہاں نے ہندوستان میں تاج محل تعمیر کیا تو ڈاکٹر سلام نے اٹلی میں تاج محل تعمیر کیا۔ ایک تاج محل سنگ مرمر سے بنا خوبصورتی کا مجسمہ ہے جبکہ اٹلی کا تاج محل اپنے آلات، ساز و سامان، کتابوں، رسالوں سے سائنسدانوں کے دماغوں کو جلا دے رہا اور انکو منور کر رہا ہے۔ یہاں تعلیم حاصل کرنیوالے طالب علم اپنے ملک اپنی قوم کا مستقبل ہیں۔ یہ طالب علم سائنس کے ذریعہ اپنی قوم کی تقدیر بدلیں گے۔ یہ طالب علم مستقبل کے لیڈر ہیں جو عبدالسلام کی مثال کو مطمح نظر بنا کر اپنی نسلوں کو سنواریں گے۔

محمد علی مضطر

تیرے کوچے میں بکھر جاؤں اگر!
حادثہ اک یہ بھی کر جاؤں اگر!
اپنی غزلوں کو سجا کر طشت میں
تیرے دروازے پر دھر جاؤں اگر!
عہد کی تصویر کو کرکے خفا
اس میں کوئی رنگ بھر جاؤں اگر!
میں تیرا ہی عکس ہوں لیکن ترے
پاس سے ہو کر گزر جاؤں اگر!
واپس آجاؤں میں اپنے آپ میں

اپنی آہٹ سے نہ ڈر جاؤں اگر!
کیوں بلا بھیجا تھا اتنے پیار سے
اب کبھی واپس نہ گھر جاؤں اگر!
تجھ سے ملنا تو انوکھی بات ہے
خود سے مل کر بھی مُکر جاؤں اگر!
حادثہ ہو جائے شہر ذات میں
اس ٹریفک میں ٹھہر جاؤں اگر!
کوئی سمجھے گا نہ اب میری زباں
لوٹ کر بارے دِگر جاؤں اگر!
عقل کے میدان میں کھا کر شکست
عشق کی بازی بھی ہر جاؤں اگر!
جی اٹھوں مضطرؔ! ہمیشہ کے لئے
مسکرا کر آج مر جاؤں اگر!

آدم چغتائی.....دُعا

اہل انصاف کو پھر تختِ سلیمانی دے
قلب مومن کو وہی وسعتِ ایمانی دے
آدمیت کو فراعینِ زمانہ سے بچا
جو ہیں مظلوم انہیں وقت کی سلطانی دے
ایک طوفان کی غماز ہیں ساقط لہریں
بحرِ خاموش کو پھر دولت طغیانی دے
بس سلامت رہے بازار میں حُسنِ یوسف
ہر خریدار کو توفیق کی ارزانی دے
حُسن ہر حال میں تسخیر جہاں مانگے ہے
حُسنِ تبلیغ کو خامسؔ سی قدر دانی دے
ایک درویش ترے در پہ چلا آیا ہے
اُس کے کشکول میں لفظوں کی فراوانی دے
میں خطا کار گنہگار ہوں مرے مولا
مری نظروں کو کوئی اور نہ حیرانی دے
جس سے وہ فتنہ شیطاں کو دبا کر رکھے
اپنے آدم کو وہی قوتِ ایمانی دے

مبارک صدیقی

دشمنوں سے بھی دوستانہ رکھ
تاک اپنا مگر نشانہ رکھ
سارے کانٹے گلاب بن جائیں
خواب آنکھوں میں شاعرانہ رکھ
ہجر کی بے پناہ غربت میں
وصل کی آس کا خزانہ رکھ
ہے گرانی اگر فصیلِ شب
سحر سے عشق باغیانہ رکھ
جنگ کا ایک یہ بھی حربہ ہے
اپنا انداز فاتحانہ رکھ
پھر مجھے چھوڑ جا تڑپنے کو
پھر کوئی سوچ کے بہانہ رکھ
قیمتِ عشق پوچھنے والے
جان میری ابھی بیعانہ رکھ

عامر امیر

حُسن تیرا غرور اپنا تھا
سچ تو یہ ہے قصور اپنا تھا
آنکھ اور دل کی ہر زباں پہ پڑا
بولنے میں عبور اپنا تھا
رات یوں تیرے خواب سے گزرا
کہ بدن چور چور اپنا تھا
آئینے میں جمال تیرا تھا
کیونکہ تجھ میں ظہور اپنا تھا
میری ہی بے اعتنائی تھی
ورنہ وہ تو ضرور اپنا تھا
ایک ہی وقت میں جنون و خرد
لاشعور و شعور اپنا تھا
اس کا دل میرے آس پاس رہا
اور دل تجھ سے دور اپنا تھا
اس کے شعروں میں نام میرا نہ تھا
ذکر بین السطور اپنا تھا

منظر ایوبی

کس کس کو رزقِ خاک بنانا پڑا مجھے
نسلوں کا قرض تھا جو چکانا پڑا مجھے
بجھنے لگا چراغِ تمنا تو دوستو!

احسان آندھیوں کا اُٹھانا پڑا مجھے
پھر یوں ہوا کہ ہاتھ سے بندوق گر پڑی
اور دشمنوں کو سر پہ بٹھانا پڑا مجھے
جب بندگانِ حق پہ زمین تنگ ہو گئی
پانی پہ بستیوں کو بسانا پڑا مجھے
نکلا نہ جب سپاہِ جنوں سے کوئی بشر
تنہا ستونِ دار پر جانا پڑا مجھے
منظرؔ یہ حادثہ بھی مقدر میں تھا لکھا
کہ خود قاتلوں سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

منظر بھوپالی

تم بلبل ہو اس باغ کے اور ہم شانِ گلزار ہیں
ساری سانسیں تمہاری نہیں ہم بھی جینے کے حقدار ہیں
تنگ کردی گئی ہے زمین ہم پہ اس واسطے آج کل
ہم پجاری ہیں سچائی کے آئینوں کے طرف دار ہیں
دُور سے ہم کو سمجھو گے کیا پاس آکر تو دیکھو ہمیں
ہم وفا ہی وفا دوستو ہم فقط پیار ہی پیار ہیں
کر دیا قتل اک شہر کو اور مظلوم بھی بن گئے
جھوٹ کو سچ بناتے ہیں یہ کتنے اچھے اداکار ہیں
یہ اذیت بھی ذلت بھی ہے ہم پہ یہ غمِ قیامت بھی ہے
جس زمیں کے لئے مر مٹے اُس زمیں پر ہی غدار ہیں

احمد فرازؔ

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
نظر اُٹھے تو یہ سمجھو کہ دین و دل تو گئے
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو گزر کے دیکھتے ہیں
اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فرازؔ آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

پروین شاکرؔ

ہتھیلیوں کی دعا پھول لے کر آئی ہو
کبھی تو رنگ میرے ہاتھ کا حنائی ہو
کوئی تو ہو جو میرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو
گلابی پاؤں میرے چمپئی بنانے کو
کسی نے صحن میں مہندی کی باڑھ اُگائی ہو
کبھی تو ہو مرے کمرے کا ایسا منظر بھی
بہار دیکھ کر کھڑکی سے مسکرائی ہو
وہ سوچتے دیکھتے رہنے کا فسوں
کہ نیند میں ہوں مگر نیند بھی نہ آئی ہو

خالد شریفؔ

اے کہ میں تیرے لئے ہوں اور تُو میرے لئے
ابترے ہاتھوں پہ لکھا ہے لہو میرے لئے
میری بکھری ٹکڑیوں میں پھوٹنے والے ہیں پَر
میرے قاتل جال پھیلا چار سُو میرے لئے
کاش ایسا ہو کہ اب کے بے وفائی میں کروں
تُو پھرے قریہ بہ قریہ کُو بہ کُو میرے لئے
میں تو لا محدود ہو جاؤں سمندر کی طرح
تُو بہے دریا بہ دریا جُو بہ جُو میرے لئے
پھر زمیں کی سسکیاں اپنی لگیں خالدؔ مجھے
پھر ہُوا ہے جشنِ مرگ آرزو میرے لئے

لطیف ساحلؔ

جو بات بات پہ تکرار کرنے والا تھا
وہ شخص ہم سے بہت پیار کرنے والا تھا
تری سواری تلے آ کے مر گیا جو
ترا قریب سے دیدار کرنے والا تھا
تبھی نے مان لیا میری بے گناہی کو
میں اپنے جُرم کا اقرار کرنے والا تھا
خطا یہی تھی کہ چُھپ چُھپ کے تیرا نام لیا
یہ جُرم تو سرِ بازار کرنے والا تھا
اُداس لوگوں کی غمخواری کرتے تھے
یہ مشغلہ ہمیں بیمار کرنے والا تھا

میں خود بھی کھو گیا خوابوں کے سحر میں ساحلؔ
اسے میں نیند سے بیدار کرنے والا تھا

سعداللہ شاہؔ

تلخیِ زیست کے عذاب کے ساتھ
ہم کو رکھا گیا حساب کے ساتھ
ہم کوئی خواب سی حقیقت تھے
یا حقیقت جُڑی تھی خواب کے ساتھ
اختتام سفر کھلا ہم پہ
وسعتِ دشت تھی سراب کے ساتھ
اے شبِ آگہی ستارے چُن
بام روشن ہے ماہتاب کے ساتھ
وہ گنہگار ہیں جو رکھتے ہیں
نشہء چشم کو شراب کے ساتھ
سعدؔ سود و زیاں کی بستی میں
کون کتنا چلے جناب کے ساتھ

نوشی گیلانیؔ

جو درد کے صحرا میں اکیلا بھی بہت ہے
اس کے لئے دیوار کا سایہ بھی بہت ہے
دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت ہے
کچھ تجھ کو محبت پہ یقین تھا نہ وفا پر
کچھ دُکھ میری تقدیر میں لکھا بھی بہت ہے
بینائی اندھیروں سے بھلا کیسے بچاتا
اک شخص ترے ہجر میں جاگا بھی بہت ہے
وہ اور ہیں جو چھو کے تجھے دیکھنا چاہیں
مجھ کو تو مرے خواب کی دنیا بھی بہت ہے

فرحتؔ عباس شاہ

اس کو موسم بھی بدلنے کی ادا آتی ہے
زلف لہرائے تو ساون کی گھٹا آتی ہے
شہر جاتی ہے تو ڈرتا ہوں کہ ہر بار ہوا
میرے بارے میں نئی بات اُڑا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو کوئی روتا ہے سینے میں
دل دھڑکتا ہے تو ماتم کی صدا آتی ہے
راستہ دینے لگے بکھرے ہوئے پتے کیسے
کس جنازے کو لئے بادِ صبا آتی ہے
تیرے مل جانے کی امید تواتر سے مجھے
روز لے جا کے تری راہ پہ بٹھا آتی ہے
تخت سے تختے پہ لے آؤ تو پھر بھی کیا ہے
ہم کو ہر ڈھنگ میں جینے کی ادا آتی ہے

فرخ زہرا گیلانیؔ

اس کی نفرت کو سانحہ لکھا
اپنی چاہت کو حادثہ لکھا
میں تاروں سے ہمکلامی کی
تیری یادوں کا سلسلہ لکھا
ہم تو تنہا چلے تھے منزل کو
اہل دل نے ہے قافلہ لکھا
وہ مسافر ہی معتبر ٹھہرا
جس نے منزل کو راستہ لکھا
میں نے طوفان سے دوستی کرلی
بہتے پانی پہ فیصلہ لکھا

شہناز مزملؔ

دمِ رُخصت اُسے جینے کی دعا دی ہم نے
اور پھر آخری کشتی بھی جلادی ہم نے
مل ہی جائے کسی تعبیر کو کوئی خواب
عکسِ دیوار پہ تصویر بنا دی ہم نے
رُوح کو جسم کے زندان میں رکھنے کے لئے
بزمِ اُمید ستاروں سے سجا دی ہم نے
ہم اسیرانِ اَنا تشنہ لبِ بام گئے
بازی زیست بھی داؤ پہ لگا دی ہم نے
تیرگی حد سے بڑھی دل کے نہاں خانوں میں
بھولنے والے تری یاد جلادی ہم نے
اپنی ہی سانسوں سے دم گھٹنے لگا جب شہناز
قرضِ جاں دے کے سزا گھٹا دی ہم نے

شکیل سروشؔ

مسندِ دل پہ تری یاد بٹھا رکھی تھی
ایک خوہش تھی جو سینے میں دبا رکھی تھی

کس نے اے دوست بٹھا رکھا تھا آنکھوں پہ تجھے
روشنی یہ کس نے آنکھوں پہ سجا رکھی تھی
کٹ کے مر جانے کا انداز بھی سمجھایا تھا
بچ کے آنے کی بھی تدبیر بتا رکھی تھی
اس لئے تجھ کو مری آنکھیں لگی تھیں مانوس
میں نے اُن میں تری تصویر بنا رکھی تھی
بارِ غم سر پہ اُٹھائے ہوئے پھرتا تھا سروشؔ
آنکھوں میں اشکوں کی سوغات اُٹھا رکھی تھی

قاری صادق جمیلؔ

سوچوں سے بھی عکس بنایا جا سکتا ہے
اندھی آنکھوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے
ہم سے تو آباد نہ ہو پایا اک گھر بھی
تم چاہو تو شہر بسایا جا سکتا ہے
ڈوبتے منظر دیکھ کے جشن منانے والے!
تیرے گھر کی سمت بھی دریا جا سکتا ہے
ہر جانب کیوں دیواروں کا سوچ رہے ہو
ہر دیوار میں در بھی رکھا جا سکتا ہے
اُڑتی ریت میں تم بھولے سے آجاؤ تو
صحرا کو گلزار بنایا جا سکتا ہے

حمیدہ شاہینؔ

لطف تری ہم دوشی کا
راہ مری مدہوشی کا
تیرے پیار کا ہر لمحہ
نُور سے ہم آغوشی کا
روشنیاں ترے جذبوں کی
حسن تری سرگوشی کا
خوشبو تیرے حرفوں کی
ایک مزا گُل پوشی کا
ہجر سہا اس دل نے جو
ملزم تھا کم کوشی کا
شاہینؔ پیاری گیت نہ گا
موسم ہے خاموشی کا

آصف شفیع

راہِ جنوں پہ چل پڑے، جینا محال کر لیا
ہم نے تلاشِ حُسن میں خود کو نڈھال کر لیا
مجھ کو تو خیر چھوڑیئے میری تو اور بات تھی
یہ بھی بہت ہے اس نے کچھ اپنا خیال کر لیا
کیسے وہ دن تھے پیار کے خُود پہ بھی جب یقین تھا
پل میں جدائی ڈال لی، پل میں وصال کر لیا
جیتے رہے ہیں وصل میں، مرتے رہے ہیں ہجر میں
یہ بھی کمال کرلیا ،وہ بھی کمال کر لیا
اپنی بھی کچھ خبر نہیں، دل کی بھی کچھ خبر نہیں
ہم نے تمہارے ہجر میں کیسا یہ حال کر لیا

حسن عباسیؔ

جانے والے کو بُلایا جائے
کوئی آنسو نہ بہایا جائے
عین ممکن ہے پلٹ آؤں میں
مجھ کو شانوں سے ہلایا جائے
آخری سانس لئے بیٹھا ہوں
مجھ کو باتوں میں لگایا جائے
ایسے اُترا ہے مرے دل سے وہ
جیسے دیوار سے سایا جائے
ڈوب جائیں نہ کہیں ہم دونوں
ہاتھ سے ہاتھ چھڑایا جائے
شہر سے اب بھی محبت ہے ہمیں
ہم کو کچھ اور ستایا جائے

سید امتیاز احمد

لو پھر آئی صدا اُن راستوں کی
نہیں بھولی ہوا اُن راستوں کی
کبھی ہم نے دعا مانگی تھی، ہم کو
کرے مٹی خدا اُن راستوں کی
اگر کوئی مسافر آئے پوچھیں
کہ اب صورت ہے کیا اُن راستوں کی
وہاں کیا مجھ کو پہچانے گا کوئی
کہ میں تو گرد تھا اُن راستوں کی
بہت سے رنج ہیں خوشیاں بہت سی

کوئی اک ہے عطا اُن راستوں کی
سلیم گورمانی

تعلق ہم دو گونہ چاہتے ہیں
لب و دل اُن کے چُھونا چاہتے ہیں
بڑی بے ذائقہ ہے زندگانی
کوئی ساجن سلونا چاہتے ہیں
نگاہ و چشم و لب یکبار مرے
وہ نازک ہاتھ چھونا چاہتے ہیں
ہمیں دھتکارنے والے ذرا سُن
جواباً تجھ کو دُونا چاہتے ہیں
تری فرقت میں اپنے دل کی مانند
جہاں بھر سُونا سُونا چاہتے ہیں

ثناءاللہ شاہ

تو نے سمجھا ہی نہیں میری محبت کا مزاج
میں تری سوچ سے آگے بھی تو جا سکتا ہوں
میں اکیلا ہی نہیں ساتھ مرے تو بھی تو ہے
آسماں چھو کے میں واپس بھی تو آسکتا ہوں
میں ہوں مٹی تو مرا رزق زمیں تک ہی نہیں
میں تو جنت میں بھی اک پیڑ لگا سکتا ہوں
میں ہوں انساں مرا مٹی سے خمیر اُٹھا ہے
اپنے رونے سے مگر عرش ہلا سکتا ہوں
تو نے ایسے ہی زمانے کا کہا مان لیا
تیری تحریر کو میں کیسے جلا سکتا ہوں

نبیل احمد نبیلؔ

یہ مکیں کے لئے ہے نہ مکاں کے لئے
ہوائے تُند چلی ہے چراغِ جاں کے لئے
تمام عمر مسافت میں کاٹ دی ہم نے
پس غبارِ نظر ایک مہرباں کے لئے
تمام گھر کی نگاہیں لگی تھیں تحفوں پر
میں سب سے قیمتی تحفہ تھا اپنی ماں کے لئے
خود اپنی موت کا سامان کر لیا ہم نے
اُٹھا کے ہاتھ تری عمرِ جاوداں کے لئے
اُتار لائے ہیں سورج کو آسماں سے ہم
یہ اہتمام ضروری تھا سائباں کے لئے
نبیلؔ خود ہی سپرد زمین کرنے پڑے
جو چاند ہم نے تراشے تھے آسماں کے لئے

راشد مراد

قبیلے والو اُٹھو کہ قسمت میں پھر اذیت لکھی گئی ہے
چنار پیڑوں کی چھاؤں سے بھی ہماری ہجرت لکھی گئی ہے
مدار میں گھومتے ستاروں کے واسطے تو سکوں رقم ہے
حدودِ معمولی توڑنے کی سزا قیامت لکھی گئی ہے
فراق صدیوں کا لوحِ دل پر کوئی نشاں بھی نہیں ہے لیکن
رفاقتوں میں گزرنے والی ہر ایک ساعت لکھی گئی ہے
گئے دنوں میں وہی بدن جو مثالِ سادہ ورق تھے راشد
وصالِ بارش ہوئی تو اُن پر دھنک عبارت لکھی گئی ہے

بخش لائلپوری

خرد کو جہالت، جہالت کو دانش
مرے عہد کے دیدہ ور بولتے ہیں
لہو بولتا ہے ٹپک کر رگوں سے
سناں پر شہیدوں کے سر بولتے ہیں
اثر ان کی باتوں کا ہوتا نہیں ہے
وہ بزمِ سخن میں مگر بولتے ہیں
جہاں خوف و دہشت سے چپ ہیں
زبانیں وہاں بخش جیسے نڈر بولتے ہیں

وسیم بٹ وسیم

وفا کے سائے تلے خود کو آشکار تو کر
تو مجھ میں رہ کے تھوڑا انتظار تو کر
میں ایک عمر سے تیرے دل و دماغ میں ہوں
مجھے قبول نہ کر میرا اعتبار تو کر
ہوا میں غم کے در و بام تو بنا ڈالے
یقین کی چھت تو بنا خود پہ انحصار تو کر
یہ تیرا ”حوالہ“ سمجھ میں آ بھی چکے
کسی مقام پہ رُک کے ذرا قرار تو کر
مرے بغیر ترا ارتقا قبول مگر
حدیثِ ہجر میں ذکرِ وفا شمار تو کر
بلا جواز تری سمت کس بنا پہ چلوں

مری طلب کے وہ حالات سازگار تو کر
تو اپنی ذات کی وسعت میں بے کنار سہی
کبھی زمیں پہ اُتر کے مرا حصار تو کر

ساحرشیوی

پیار کی سیج سجائے کون
من کا دیپ جلائے کون
جیون کتنا سونا ہے
مجھ کو اپنا بنائے کون
بیتی عمریا روتے روتے
کانٹوں پر ہی سوتے سوتے
غم کی آگ بجھائے کون
مجھ کو اپنا بنائے کون
سندر سپنے میں نے سجائے
شہری بابو پھر نہیں آئے
ایسا دھوکا کھائے کون
مجھ کو اپنا بنائے کون
دُکھ اپنا کس کو سناؤں
کس کو اپنا دوست بناؤں
کون میرے ہیں پرائے کون
مجھ کو اپنا بنائے کون
سونی ہے ہر راہ گزر
پھولوں سے خالی گلزار
پریم کی بستی بسائے کون
مجھ کو اپنا بنائے کون

حنیف تمناجرمنی

یہ کیا طرفہ تماشہ ہو رہا ہے
ہر اک شخص اپنا چہرہ کھو رہا ہے
کوئی تو ہے پس پردہ زحمت
کوئی تو فکرِ دہشت بو رہا ہے
ہے نالاں قوم تو کیا! رہبروں سے
کوئی تو ہے جو خوش ہو رہا ہے
یہ کیا کہ دامنِ ملزم سے لطفاً
لہو کے داغ منصف دھو رہا ہے
وطن میں لوگ فاقوں مر رہے ہیں
وہ اک منصف کا رونا رو رہا ہے
تھی آزاد عدلیہ، نہ ہے نہ ہوگی
کہ تو رونا سیاسی رو رہا ہے
جگا کے شہر میں وہ فتنہ سازی
شبستاں میں سکوں سے سو رہا ہے
وہی اوروں کے سر الزام رکھنا
وہی کاٹے گا جو بو رہا ہے

سیّدمعراج جامی

آپ کی دوستی سے ڈرتے ہیں
ورنہ ہم کب کسی سے ڈرتے ہیں
تیرگی جس سے چار سُو پھیلے
ہم اس روشنی سے ڈرتے ہیں
ہم کو سایے سے ڈر نہیں لگتا
ہاں مگر آدمی سے ڈرتے ہیں
جانے کب غم کی نظر ہو جائے
اپنے لب کی ہنسی سے ڈرتے ہیں
ہاں کبھی بیخودی سے ڈرتے تھے
آج کل ہم خودی سے ڈرتے ہیں
سارے اپنے پرائے ایک ہوئے
اب ہم ہر کسی سے ڈرتے ہیں
یورشِ غم سے ہم نہیں ڈرتے
اپنے گھر کی خوشی سے ڈرتے ہیں
ظلم ٹوٹے ہیں اتنے آنکھوں پر
اب تو ہم خواب ہی سے ڈرتے ہیں
شاہ سے ہم کو ڈر نہیں لگتا
شاہ کی مفلسی سے ڈرتے ہیں
رات کا خوف جن پہ طاری ہے
جانے کیوں شام ہی سے ڈرتے ہیں
خود ہی کرتے ہیں دوستی میں پہل
اور پھر دشمنی سے ڈرتے ہیں
آج کل کے سخن طرازوں کی
جامؔی ہم شاعری سے ڈرتے ہیں

منور احمد کنڈے

وقت کے باغات میں اشجار ہیں پر پھل نہیں
زندگی کب زندگی ہے اس میں گر ہلچل نہیں
بجلیاں آ آ کے گرتی ہیں نشیمن پر ہزار
چلچلاتی دھوپ ہے میلوں تک بادل نہیں
کس طرح اس کو دکھائیں کیسے سمجھائیں اسے
قتل ارماں ہو گئے لیکن کوئی مقتل نہیں!
ریزہ ریزہ ہو چکے ہم خاک میں ملنے کو ہیں
آج کے مہماں ہیں شاید اس جہاں میں کل نہیں

افتخار عارف

غیروں سے دادِ جورو جفا لی گئی تو کیا
گھر کو جلا کے خاک اُڑادی گئی تو کیا
غارت گری شہر میں شامل ہے کون کون
یہ بات اہل شہر پہ کُھل بھی گئی تو کیا
اک خواب ہی تو تھا جو فراموش ہو گیا
اک یاد ہی تو تھی جو بُھلادی تو کیا
میثاق اعتبار میں تھی اک وفا کی شرط
اک شرط ہی تو تھی جو اُٹھا دی گئی تو کیا
قانونِ باغبانی صحرا کی سر نوشت
لکھی گئی تو کیا جو نہ لکھی گئی تو کیا
اس قحط و انہدام روایت کے عہد میں
تالیفِ نسخہائے وفا کی گئی تو کیا
جب میرؔ و میرزا ؔ کے سخن رائیگاں گئے
اک بے ہنر کی بات نہ سمجھی گئی تو کیا

باصر سلطان کاظمی

خط میں کیا لکھوں یاد آتی ہے ہر بات پہ بات
یہی بہتر کہ اُٹھا رکھوں ملاقات پہ بات
رات کو کہتے ہیں کل بات کریں ہے دن میں
دن گزر جائے تو سمجھو گئی رات پہ بات
اپنی باتوں کے زمانے تو ہوا برد ہوئے
اب کیا کرتے ہیں ہم صورتِ حالات پہ بات
لوگ جب ملتے ہیں کہتے ہیں کوئی بات کرو
جیسے رکھی ہوئی ہوتی ہو مرے بات پہ بات
مل نہ سکنے کے بہانے اُنہیں آتے ہیں بہت
ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی ہم بھی ملاقات پہ بات
دوسروں کو بھی مزا سننے میں آئے باصرؔ
اپنے آنسو کی نہیں کیجیے برسات پہ بات

ڈاکٹر انور سدید

دَر اُس نے اپنے در کا کشادہ نہیں کیا
ہم نے بھی اس طرف کا ارادہ نہیں کیا
برتا جو اس نے بخلِ مروت میں دوستو!
ہم نے بھی التفات زیادہ نہیں کیا
بے حد و بے حساب کرم اس نے کر دیا
گر چہ طلب خدا سے زیادہ نہیں کیا
گردن فراز شہر کے لوگوں کے درمیاں
ہم نے تو سَر کا زاویہ حادہ نہیں کیا
تسلیم ہم کہ رہنِ انا کے اسیر تھے
اس نے بھی اپنا ظرف کشادہ نہیں کیا
انورؔ سدید دور نمائش کا تھا مگر
کام ہم نے کوئی نام نہادہ نہیں کیا

سرور سودائی

مُصر اس پر اگرچہ دل بہت ہے
کسی کو چاہنا مشکل بہت ہے
بظاہر لا تعلق دے جو مجھ سے
میری باتوں میں وہ شامل بہت ہے
محبت اور نفرت دوستوں کی
مجھے جتنی بھی ہے حاصل بہت ہے
مجھے اذنِ سفر جتنا دیا تھا
میرے رستے میں وہ حائل بہت ہے
میں اندھا ہو رہا ہوں روشنی میں
میری آنکھوں میں اب جھلمل بہت ہے

حفیظ جوہر

درد کی انتہا غمِ دنیا
اس سے آگے ہے کیا غمِ دنیا
دل میں شب روشنی سی پھوٹی تھی
وہ ستارہ تھا یا غمِ دنیا

اب تو جینے کی تگ و دو ہے
پہلے کچھ اور تھا غمِ دنیا
اس سے پوچھا کہ دوست ہے کوئی
میں نے اس سے کہا غمِ دنیا
دور ہوتا گیا کوئی دل سے
اور بڑھتا گیا غمِ دنیا
تجھ سے کوئی گلہ نہیں، اب تو
راس آنے لگا غمِ دنیا

مرتضیٰ برلاس بیگ.....مرسلہ بی اے رفیق

آنکھ برسی ہے ترے نام پہ ساون کی طرح
غم سُلگا ہے تری یاد میں ایندھن کی طرح
لوریاں دی ہیں کسی قُرب کی خواہش نے مجھے
کچھ جوانی کے بھی دن گزرے ہیں بچپن کی طرح
اس بلندی سے تو نے مجھے نوازا کیوں تھا
گر کے میں ٹوٹ گیا کانچ کے برتن کی طرح
مجھ سے ملتے ہوئے یہ بات تو سوچی ہوتی
میں ترے دل میں سماجاؤں گا دھڑکن کی طرح
منتظر ہے کسی مخصوص سی آہٹ کے لئے
زندگی بیٹھی ہے دہلیز پہ برہن کی طرح

صابر رضا

جو ایک بار ملا تھا مجھے جوانی میں
اب اس کا ذکر بہت ہے مری کہانی میں
بدن وہی ہے وہی خواہشوں کے پہناوے
نہیں ہے جوش مگر خون کی روانی میں
مجھے یقین ہے کہ پلٹنا ہے خالی ہاتھ مجے
میں جال پھینک چکا ہوں اگرچہ پانی میں
وفا شعار تھے ہم لوگ، زندگی بھر ہم نے
گزار دی ہے ترے غم کی پاسبانی میں

اسحاق ساجد جرمنی۔۔۔گیت

پیار کے گیت میرے میت بتا کیسے لکھوں
ہر طرف اندھیرا ہے
نفرتوں کا پہرا ہے
ظلم کی سیاست میں
قاتلوں کا ڈیرا ہے
پیار کے گیت میرے میت بتا کیسے لکھوں
بغض ہے اداؤں میں
زہر ہے فضاؤں میں
جل رہے ہیں گاؤں
آگ ہے ہواؤں میں
پیار کے گیت میرے میت بتا کیسے لکھوں
جسم سوکھے ہیں
کتنے بھوکے ہیں
سوچتے نہیں اس پر
لوگ کتنے روکھے ہیں
پیار کے گیت میرے میت بتا کیسے لکھوں
رنگ یہ تجارت کے
کاروبار عصمت کے
خوش ہیں بے ضمیری میں
بھوکے لوگ دولت کے
پیار کے گیت میرے میت بتا کیسے لکھوں
دور ہے یہ وحشت کا
ہے عروج رشوت کا
اُٹھ گیا جنازہ اب
پیار اور محبت کا
پیار کے گیت میرے میت بتا کیسے لکھوں

راجہ محمد یوسف

اے وقت کے ہامان و فراعین کے چیلو
اب ان کے مظالم کی سزا تم بھی تو جھیلو
کچھ ان کی حماقت کا مزا تم بھی تو چکھو
پھر موت کی بازی ہے اسے تم بھی تو کھیلو
نیچے سے زمیں پاؤں کی زنجیر بنے گی
اوپر سے خدا مارے گا ابلیس کے چیلو
یہ نوح کی کشتی نہ کبھی ڈوبے گی تم سے
اے مکر کے بپھرے ہوئے طوفاں کے ریلو
میں اب بھی تمہارا ہوں مجھے غور سے دیکھو

جاں اب بھی تمہاری ہے بڑے شوق سے لے لو
چھیڑو نہ مجھے بابِ تخیل سے لپٹ کر
اس شورشِ دنیا کے الم ناک جھمیلو

وہی آشیاں عبدالمجید ظفر

کبھی ہم بھی تھے یونہی محترم کبھی ہم بھی اہلِ وقار تھے
یہیں ساتھ ساتھ تھیں بستیاں جہاں ہم بھی اہلِ دیار تھے

پھر کیا ہوا کہ ہوا چلی رُخ بادباں کے پلٹ گئے
رہی کشتیاں نہ ہی ناخدا نہ ہی وہ جو ان میں سوار تھے

کچھ تو بتاؤ بلبلو گلشن میرے کی داستاں
چُن چُن کے کس نے چُن لیے وہی گل جو فخرِ بہار تھے ہو کے مبتلا
تیرے عشق میں ہوشِ جاں رہی نہ قرارِ دل
تجھے کیا کہوں میری خامشی ارماں جی میں تو بے شمار تھے

نہ ہو بدگماں میری جانِ جاں وہی پیڑ ہے وہی آشیاں
جھولا نما وہی ڈالیاں تیری ہر خوشی پہ نثار تھے

ہم نے کہا تم ہو وہی اُس نے کہا تم وہ نہیں
ہم ہو گئے نادم ظفر سمجھے کہ وہ دلدار تھے

ماں

ماں کی اُلفت بھری دعا لے لو
اُس کے انفاس کی ضیاء لے لو
مان کر اس کی ہر نصیحت کو
تم یہیں خُلد کا مزہ لے لو
تم اُجالا ہو گود کی اُس کا
اُس کو خوش رکھ کے ہر جزا لے لو
وقت کی دھوپ نی جھلس ڈالے
اُس کی شفقت بھری قبا لے لو
قلب صافی سے اُس کو خوش رکھکر
اپنے مولا کی تم رضا لے لو
شب کو رب کے حضور اپنے لئے
اُس کی بے لوث التجاء لے لو
الغرض کرکے خدمت مادر
اُس کی ہر دم دلی دعا لے لو

انمول موتی

☆ ہونٹ بغیر سُرخی کے بھی پرکشش ہو سکتے ہیں اگر بر وقت کھولے جائیں۔☆ آنکھوں میں چمک بغیر کاجل کے بھی ہوسکتی ہے اگر ان میں حیا ہو۔☆ چہرہ بغیر میک اَپ کے بھی دلکش نظر آسکتا ہے اگر دل کا رنگ صاف ہو۔☆ پیشانی بغیر بندیا کے بھی خوبصورت دکھائی دے سکتی ہے اگر خدا کے آگے جھکے۔☆ کان بغیر جھمکوں کے بھی خوبصورت ہوسکتے ہیں بشرطیکہ اچھی بات سنیں۔

غور کرنے کی بات

کسی نے عقل سے پوچھا کہ تم کہاں رہتی ہو اس نے جواب دیا دماغ میں۔ پھر شرم سے پوچھا کہ تم کہاں رہتی ہو اس نے کہا کہ آنکھ میں۔ محبت سے پوچھا تو اس نے کہا دل میں۔ پھر غصہ کی باری آئی تو اس نے کہا دماغ میں۔ لیکن دماغ میں تو عقل رہتی ہے غصہ بولا کہ جب میں آتا ہوں تو عقل بھاگ جاتی ہے۔ عشق سے پوچھا تو کہاں رہتا ہے۔ بولا آنکھ میں۔ آنکھ میں تو شرم رہتی ہے عشق بولا میرے آنے سے شرم بھاگ جاتی ہے۔ لالچ سے پوچھا تیرا ٹھکانا کہاں ہے بولا دل میں۔ لیکن دل میں تو محبت رہتی ہے لالچ نے کہا میرے آنے سے وہ رفو چکر ہو جاتی ہے۔

جواب۔...ایک دُبلا پتلا میاں اور اس کی بہت موٹی اور صحت مند بیوی کی لڑنے جھگڑنے کی آوازیں ہمسایوں تک بھی پہنچتی تھیں
برابر والے گھر میں عورت نے سوچا۔ مجھے ان دونوں کو سمجھانا چاہیئے
کہ ہر وقت آپس میں لڑنا اچھی بات نہیں۔ ایک دن جب ان کے آپس میں لڑنے کے آوازیں آئیں تو اس نے دونوں کو سمجھانا چاہا کہ ”تم دونوں آپس میں نہ لڑا کرو۔ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہوتے ہیں اپنی زندگی کی گاڑی خوشگوار انداز میں چلاؤ“۔ میاں جو پہلے ہی جلا بھُنا بیٹھا تھا نے جواب دیا ”وہ گاڑی کیا خاک چلے گی جس کا ایک پہیہ ٹریکٹر کا اور ایک سائیکل کا ہو“۔

استاد: (شاگرد سے) بتاؤ! تمہیں سب سے زیادہ خوشی کس دن ہوتی ہے؟ شاگرد فوراً بولا: جناب ! جب آپ سکول نہیں آتے“۔

ایڈمیشن کے لئے آئے ہوئے بچے سے پرنسپل نے سوال کیا۔ ”بیٹے تمہارے ابو کیا کرتے ہیں؟ بچے نے جواب دیا۔ ”جو امی کہتی ہیں وہی کرتے ہیں“ ایک مریض ڈاکٹر کے کلینک پر گیا وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں اس کے سوا کوئی مریض نہیں ہے۔ اس نے حیرانی سے پُوچھا ”ڈاکٹر صاحب اور مریض کہاں ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے قبرستان کی طرف اشارہ کرکے کہا ”وہ سب وہاں آرام کر رہے ہیں“۔ دو آدمی ریڈیو پر

موسیقی سن رہے تھے۔ایک نے کہا ''واہ کیا درد بھری آواز ہے'' دوسرا بولا۔''واقعی، یہ آواز سن کر میرے سر میں درد ہونے لگا ہے''۔موتی۔۔سب سے بڑی کمزوری مایوسی ہے۔انسان اپنے معاملات سے پہچانا جاتا ہے حکمت عملی قوت بازو سے زیادہ کام کرتی ہے خاموشی بغیر تخت کے بادشاہی ہے سب سے اچھا وقت وہ ہے جو اطاعت الٰہی میں گزرے۔صلہ رحمی کرنے والا اپنا رشتہ اللہ سے جوڑتا ہے۔زندگی ایک خوبصورت موتی کا نام ہے جس کو ہم الفاظ کی لڑی میں نہیں پرو سکتے۔فخر اس میں ہے کہ اپنے تھوڑے مال پر قناعت کر اور دوسرے کے مال پر حسد کی نظر نہ ڈالو۔ہمیشہ سچائی کا ساتھ دو کیونکہ جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔قابل سے قابل انسان کو بھی غصہ، بیوقوف بنا دیتا ہے۔دلوں کو فتح کرنے کے لئے تلوار کی نہیں، پیار اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔عظمت ایک پھول ہے جسے حاصل کرنے کے لئے انسان کو محنت جیسے کانٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ستارے آسمان کی زینت ہیں جبکہ تعلیم یافتہ انسان زمین کی زینت۔

زندگی کی گاڑی۔۔زندگی کی گاڑی کو ارادے کے انجن اور وعدوں کے ڈبوں کے ساتھ، پیار کی پٹڑی پر رواں دواں رکھنے کے لئے کدورتوں سے پاک ایندھن سے ہی چلایا جا سکتا ہے اگرچہ زندگی کی گاڑی محبت کے اسٹیشن پر کچھ دیر کے لئے رک جاتی ہے مگر حسین مسافروں سے بچھڑ کر، نئے ہمسفروں کو ساتھ لے کر اور حسین مناظر کو پیچھے چھوڑ کر گرم گرم آہیں بھرتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔

چہرے۔دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں۔جنہیں خدا تعالیٰ نے خوبصورتی سے نوازا ہے۔ایسے لوگ جو خوش شکل ہوتے ہیں۔ان میں زیادہ تر اپنی انا کے خول میں بند رہتے ہیں۔وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ کوئی برتر مخلوق ہیں بلکہ صحیح معنوں میں خوبصورت اسی شخص کو کہا جاتا ہے جو خوب سیرت ہو۔لیکن اس معاشرے میں خوب سیرت کی تو اتنی تعظیم نہیں کی جاتی جبکہ خوبصورت کی سب عزت کرتے ہیں، سب ان پر جان چھڑکتے ہیں۔میرے خیال میں خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو کس زاویئے سے دیکھتا ہے۔محبت اور شک۔۔محبت کی پہلی اور آخری بنیاد اعتماد ہے۔محبت میں صرف آغاز ہوتا ہے اختتام کبھی نہیں ہوتا۔شک ایک دیمک ہے، جو محبت کرنے والے کو اندر ہی اندر کھا جاتی ہے۔آپس میں پیار رکھو کیونکہ پیار دلوں کو شک سے صاف رکھتا ہے۔محبت ایک دیوار ہے اگر اس میں شک کا سیمنٹ نہ ہو تو یہ کبھی نہیں گر سکتی۔سنگسار ایک صاحب کے جوش ملیح آبادی کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔کئی روز غیر حاضری کے بعد ملنے آئے تو جوش صاحب نے وجہ پوچھی۔کہنے لگے؛ کیا بتاؤں جوش صاحب، پہلے ایک گردے میں پتھری تھی اس کا اپریشن ہوا اب دوسرے گردے میں پتھری ہے۔جوش صاحب: میں سمجھ گیا اللہ تعالیٰ آپ کو اندر سے سنگسار کر رہا ہے۔فرق۔فراق گورکھپوری سے کسی نے پوچھا: بحیثیت شاعر آپ اور جوش صاحب میں کیا فرق ہے؟ فراق: جوش موضوع سے متاثر ہوتا ہے اور میں موضوع کو متاثر کرتا ہوں۔سوزاک۔سوز شاہجہانپوری ایک دن لکھنو کافی ہاؤس میں آ گئے اور مجاز صاحب کے میز پر آ بیٹھے۔کہنے لگے: بھائی مجاز میں نے اپنا مجموعہ کلام مرتب کر لیا ہے اب اس کے لئے کسی موزوں نام کی تلاش ہے۔کوئی ایسا نام ہو جو نیا بھی ہو اور جس میں میرے نام کی رعایت بھی ہو۔مجاز نے برجستہ کہا ''سوزاک رکھ لو''۔احمق۔مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب ان کی ساتھ والی کرسی پر آن بیٹھے۔کافی کا آرڈر دے کر گنگنانے لگے۔

احمقوں کی کمی نہیں غالبؔ۔۔ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

مجاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ڈھونڈنے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے حضرت خود بخود تشریف لے آتے ہیں!

تخلیقی گداز کا مالک کالم نگار

سہیل احمد لون ایک نہایت خوب صورت دل رکھنے والا حسین فنکار ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے پیدائشی طور پر ''آرٹ لور'' بنایا ہے شاید، کالم نگار اور کمپوزر اور پتہ نہیں کیا کیا؟ اس کا دل ہمہ قوت آرٹ کی طرف لپکتا ہے پر وہ اپنی ذات اور جذبات کے اظہار کے لئے راستے تلاش کرتا رہتا ہے۔زمانے کی کجروی اور انسانی رویوں کے انسانی نہ ہونے پر اس کا دل کڑھتا ہے تو کبھی وہ شعر کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو کبھی کالم نگاری کے ذریعے احتجاج کرتا نظر آتا ہے نرم اور ملائم احساس رکھنے والا سہیل لون اپنی شاعری میں تو تخلیقی گداز کا مالک ہے ہی لیکن کالم لکھتے وقت بھی وہ نرم روی اور شائستگی کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اس کے اندر یہ تمام وصف اس کے والد کے شفاف کردار اور والدہ کی اچھی تربیت سے پیدا ہوئے میں اس بات پر بہت مسرور ہوں کہ مجھے کس خوبصورت انسان کا پیار حاصل ہے۔فرحت عباس شاہ شاعر ،ادیب، ریڈیو، ٹی وی پریزنٹر سی ای او، فرض فاؤنڈیشن ۲۶ فروری ۲۰۱۲۔

انور ندیم علوی کی کتاب ''ہارن دے کر فیل کریں'' سے ایک اقتباس۔اور پھر جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری؟

اس مملکت خداداد پر کیا گزری؟ وہ دل کہاں سے لاؤں کہ یہ داستاں خونچکاں سنا سکے؟ وہ بینا آنکھیں کہاں سے لاؤں جو یہ سب دیکھ سکیں؟ وہ کان کہاں سے لاؤں جو ان سسکتی آہوں کو سن سکیں؟ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف ہُن برسنے لگا مگر اس کو سمیٹا صرف چند گھروں نے۔۔۔یکا یک بنگلے..... پلازے اور نور محل تعمیر ہو گئے۔مگر کچھ مخصوص لوگوں کے لئے.....حدِ نظر تک لمبی لمبی کاریں اور پجارو جیپیں تھیں۔گاڑیوں کے اس اژدہام میں پیدل چلنے والوں کا پیدل چلنا مشکل ہو گیا۔یونیورسٹیاں، کالج و سکول، انگلش میڈیم ادارے ہر طرف پھیل گئے۔مگر تعلیم، ادب، کردار سب مفقود ہو گئے۔آبادی اتنی تیزی سے بڑھی کہ قصبے کارپوریشن بن گئے۔شہر پھیلتے گئے اور دل سکڑتے گئے۔جس اخوت اور بھائی ''چارے'' کے لئے یہ ملک حاصل کیا تھا گیا تھا وہ

وہاں ''بھائی'' کوئی نہ رہا صرف چارہ(جو جانوروں کی خوراک ہوتا ہے)رہ گیا۔وضعداری،احساس،باہمی احترام نام کی چیزیں ملک سے غائب ہوگئیں۔ان کی جگہ نفسا نفسی،جاہ پرستی اور خود غرضی نے لے لی ۔

پیروڈی.....اکبرخان مرسلہ۔بی اے رفیق

جب سے بیگم نے مجھے مُرغا بنا رکھا ہے
میں نے نظروں کی طرح سر بھی جھکا رکھا ہے
برتنو! آج میرے سر پر برستے کیوں ہو
میں دھو دھا کے تمہیں کتنا سجا رکھا ہے
پہلے بیلن نے بنایا میرے سر پر گومڑ
اور چمٹے نے مرا گال سُجھا رکھا ہے
سارے کپڑے تو جلا رکھے ہیں مری بیگم نے
زیب تن کرنے کو بنیان پھٹا رکھا ہے
اے کنوارو! یوں ہی شاد رہو آباد رہو
ہم کو بیگم نے تو سُولی پہ چڑھا رکھا ہے
وہی دنیا میں مقدر کا سکندر ٹھہرا!
جس نے خود کو یہاں شادی سے بچا رکھا ہے
حق نسواں کی جو لیڈر ہیں، بتائیں تو ذرا
کس نے سر تاج کو جوتی پہ اُٹھا رکھا ہے
روز لیتی ہے وہ تلاشی پولیس کی مانند
پوچھتی ہے کہاں پیسوں کو چھپا رکھا ہے
پی جا اس مار کی تلخی کو بھی ہنس کے اکبر
مار کھانے میں بھی قدرت نے مزا رکھا ہے

گوپی چند نارنگ کے خیال میں بخش لائلپوری مرحوم کی شاعری

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بخش لائلپوری کی شاعری ایک بڑے ہی گہرے تفکر،مشاہدے،مثبت اندازِ فکر اور ایک متاثر کن لہجے کی شاعری ہے۔اس میں رنگِ تغزل بھی اور انقلابی فکر بھی ہے۔علائم اور تلازموں کا ایک خوبصورت نظام بھی ہے۔ شاعر کی غزل میں ایک شعر بھی دل کو چھونے والا مل جائے تو اس غزل کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے ۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ بخش لائلپوری کی اکثر غزلوں میں دل کو چھونے والا ایک شعر تو کیا پوری کی پوری غزلیں نئے پن اور تازگیٔ فکر سے عبارت ہیں۔جن کی تہہ میں کئی تفاہیم اور کئی مطالب پوشیدہ ہیں۔ان کی آواز شعری امکانات کی ایک پُر تجسّس، گہری سوچ کی حامل اور محترم آواز متصور کی جائے گی۔ان کا اپنا اسلوب بیان ہے،اپنا انداز ہے اور ان کے کلام میں کسی کی چھاپ نہیں جو شخص اس تہہ دار شاعری کو ایک پرت کی شاعری کہتا ہے اس نے یقیناً بخش لائلپوری کے کلام کو نہیں پڑھا۔مجھے خوشی ہے کہ بخش لائلپوری کی نے شاعری کی ہے وقت ضائع نہیں کیا۔(ماہنامہ انشاء کلکتہ دسمبر ۱۹۹۸ء)

معروف شاعر وسیم بٹ وسیم کی خوبصورت غزلوں اور نظموں کا مجموعہ'' دھنک کے سامنے''وسیم بٹ وسیم کی شاعری سے متعلق کچھ قیمتی آرا اور تبصرے ۔۱۔وسیم بٹ وسیم شاعری تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی سے دل لگا کر کرتے ہیں (دختر جمیل جالنی سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی) ۲۔دھنک کے سامنے ایک مرقع ہے جس میں حیرت واستعجاب کی کیفیت بھی ہے اور آج کے سماج کو آئینہ بھی دکھایا گیا ہے(جگن ناتھ آزاد)۔۳۔وسیم بٹ وسیم کے کلام میں مجھے جذبات واحساسات کے گوناگوں مسائل پر فکر کرتا ہوا ذہن دکھائی دیتا ہے(احمد ندیم قاسمی)

۴۔ایسا معلوم ہوتا ہے ان کے شعر کا علاقہ اپنے ملک سخن کی مانوس اور آشنا سرحدوں میں کہیں واقع ہے۔(افتخار عارف)۵۔نظم کے لہجے میں بھی غزل کا آہنگ نظر آتا ہے لیکن نظم میں وسیم کی شاعری کا اُفق وسیع تر ہوتا نظر آتا ہے(کشور ناہید)۶۔وسیم بٹ وسیم نے نظم کی ہیکوں کو استعمال کیا ہے۔ان کی نظمیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظم کہنے کی فطری استعداد رکھتے ہیں۔(امجد اسلام امجد)۷۔وسیم بٹ وسیم نے غزل میں نئے تجربات کیے ہیں نظم میں روایت کی ایک نئی تصویر کو اُجاگر کیا ہے شعر کو ابہام کا شکار ہونے سے شعوری طور پر بچایا ہے(نجم الثاقب)

فوزیہ مغل ''شمع چوہدری'' کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں۔مہکتے ہوئے پھول۔شمع چوہدری کی شاعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ موسم بہار میں کسی مہکتے ہوئے گلستان میں داخل ہوگئے ہوں، جہاں پر شمع چوہدری کی شاعری رنگ برنگے شگوفوں کی صورت میں کہیں گیت، کہیں نظم اور کہیں غزل کا روپ دھارے اپنی بہار دکھا رہی ہوں۔اس طرح قبولِ عام کی سند حاصل کرنے والی شاعری کے لئے اسلوبِ وبیان پر قدرت رکھنے کے علاوہ وسیع النظری و کثیر المعلومات سے سرفرازی بھی ضروری ہے اور شمع چوہدری اس میں سرخرو ہیں۔(ملائم شام) جدید محبت نامہ۔جان سے پیاری جاناں! تم تو جانتی ہو کہ تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں مگر جاناں ہماری محبت ایک صورت میں امر ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ تمہارے گھر والے، میرے والدین کی خواہش (یعنی جہیز کی فہرست) پوری کردیں۔جان تم تو جانتی ہو کہ میرے والدین نے مجھ پر اب تک کتنا روپیہ خرچ کیا ہے۔مجھے پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ میں خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکوں۔میں اپنے والدین کی خواہش(یعنی جہیز کی لسٹ) کو رد نہیں کرسکتا۔مجھے امید ہے کہ تم میری سچی محبت کی خاطر ضرور اپنے گھر والوں کو اس معمولی فرمایش پر عمل درآمد کروالو گی ۔فقط(تمہارا محبوب) فہرست جہیز۔۱۔ایک زیرو میٹر کار۔۲۔ایک عدد ٹی وی، وی سی آر، ڈش انٹینا۔۳۔ایک کنال کا پلاٹ+کاروبار میں نصف حصہ۔۴۔ پانچ لاکھ روپے نقد+فریج+ڈیک

(جاپانی)۔۵۔تمہارے بھائی کی شہر والی دکان۔۶۔ایک عدد سونے کی گھڑی+انگوٹھی۔۷۔اور شادی کا سارا خرچ۔مختصر۔ مختصر ایک دفعہ بچے شرارتیں کررہے تھے شوروغل میں رشید صاحب مداخلت سے تنگ آ گئے ایک دوبار سمجھایا بھی مگر بچے باز نہ آئے۔آخر اپنی بیگم کو آواز دی اور اس سے کہنے لگے'' بیگم اپنی اُمت کو سنبھالو مجھے کام کرنے نہیں دیتے۔''، بیگم بالی ''میری امت سے آپ کا کیا مطلب ہے.....میں انہیں جہیز میں لے کر تو نہیں آئی تھی۔''مگر'' رشید صاحب بولے میں بھی انہیں بارات میں ساتھ لیکر نہیں گیا تھا۔

رانجھے کی تلاش.....لطیف قریشی امریکہ

ایک سیدھے سادے کسان نے تو قصہ ہیر رانجھا کو اپنے بیٹے پر یوں واضح کیا تھا کہ بیٹا اکبرِ اعظم سے کچھ پہلے صوبہ پنجاب میں واقع گاؤں تخت ہزارے کے رانجھوں کے ایک لڑکے دھیدو نے جھنگ شہر کے سیالوں کی لڑکی ہیر سے عشق کیا تھا۔اور کھیڑوں کے ایک لڑکے سیدو سے ہیر کی شادی ہو جانے کے بعد اسے اسکے سسرال سے اغوا کرلایا تھا قصہ شعراء کے ڈھائے چڑھ گیا پھر انہوں نے اسے کچھ کا کچھ بنادیا۔پنجابی زبان کے عظیم شاعر وارث شاہ نے تو رانجھے کو انسانی جسم اور ہیر کو اس کی روح قرار دے کر قصہ ہیر رانجھا کے نام سے ایک لازوال شاعرانہ تمثیل کردی۔جس میں حکمت و دانش کے خزانوں کے علاوہ اس وقت کے پنجاب کی زندگی کی مثال کی عکاسی کردی پہلے ہیر کے حسن کے بیان کی ایک جھلکی دیکھیئے۔

کیہ ہیر دی کرے تعریف شاعر متھے چمکدا حسن مہتاب دا سی
خونی چونڑیاں رات جوں چند دوالے سُرخ رنگ شہاب دا سی
نین نرگسی مرگ مولڑے دے گلھاں ٹھکیاں پُھل گلاب دا جی
بھواں وانگ کمان لاہور دِسن کوئی حُسن نہ انت حساب دا جی
سُرمہ نیناں دی دھار وچ پھب رہیا چڑھیا ہند تے کٹک پنجاب دا جی
سیاں نال جھولا ردی آؤندی اے پر جھولدا جیویں عقاب دا جی
کُھلی وچ ترنجناں لکدی اے فیل مست جوں پھرے نواب دا جی
چہرے سوہنے تے خط وخال سوہن خوشخط جیویں حرف کتاب دا جی
جیہڑے دیکھنے دے مشتاق آہے وڈا وعدہ تنہاندا باب دا جی
چلو لیلۃ القدر کی کرو زیارت وارث شاہ اے کم ثواب دا جی

اور پھر حکمت و دانش کے صرف چند موتی:۔

آکھ رانجھیا بھاکیہ بنی تیرے دیس اپنا چھڈ سدھا رناہیں
ویرا انبڑی جایا جا ناہیں سانوں نال فراق دے مار ناہیں
ایہہ باندیاں اسیں غلام تیریکوئی ہوروچار وچار ناہیں
بخش ایہ گناہ توں بھابھیاں نوں کون جمیا جو گنہگار ناہیں
بھائیاں باج نہ مجلساں ہوندیاں نیں اتھے بھائیاں باجھ وہار ناہیں
بھائی مرن تے پوندیاں بھج باہیں بھائیاں باجھ بھرے پردار ناہیں
لکھ اوٹ ہے کول وسیندیاں دی بھایاں گیاں جیڈی کوئی ہار ناہیں
بھائی ڈھاؤندے بھائی اسار دینی بھائیاں باجھ بیلی کوئی یار ناہیں
طالع منداں دیاں لکھ خوشامداں نے تے غریب دا کوئی غم خوار ناہیں
ایکل باہیاں نوں لوکی مار دینی باہاں والیاں کوئی سار ناہیں
باہاں والیاں دی لوک کرن منت باجھ باہاندے کجھ سنسار ناہیں
وارث شاہ میاں باجھ بھایاندے سانوں جیو نا درکار ناہیں

وارث شاہ سے پہلے دمودر نامی شاعر نے بھی اس قصہ کو لکھا ہے لیکن جو بات وارث شاہ نے اس میں پیدا کی وہ اس سے نہ ہوسکی تھی۔وارث شاہ کے بعد بھی بہت سے شعراء نے اس قصے کو نظم کیا لیکن کہاں بات ماسٹر مدن جیسی!۔بہرحال دمودر اور وارث شاہ سے قبل ہی شاہ حسین نے قصہ ہیر رانجھا میں روحانیت داخل کردی تھی اور ہیر رانجھے کے عشق کو عشقِ حقیقی کا رنگ دے دیا تھا:۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپو رانجھا ہوئی
آکھو نی مینوں دیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی

اور آج تک شعراء خصوصاً پنجابی شعراء اس تلمیح اور تمثیل سے اپنی شاعری کو سجاتے ہیں۔

رانجھا اُتر پہاڑوں آیا
تے چرخے دی کوک سُن کے
ندیوں پار رانجھن دا تھانا
کیتا قول ضروری جانا
مینوں سجدے کرن توں نہ روکو
تے رانجھا مینوں رب لگدا

''نصف ایمان'' ڈاکٹر عمران مشتاق

''بہت اچھے اچھے، کپڑے پہنا کرو۔صفائی نصف ایمان ہے۔''
مولوی صاحب جب بھی اسے دیکھتے تو نصیحت کرنا نہ بھولتے۔وہ عموماً ان کی بات سُن کر سعادت مندانہ انداز میں مسکرا دیتا۔کہ''ماں باپ نے ہمیشہ یہی سکھایا تھا کہ مولوی صاحب بڑے عالم ہوتے ہیں اور ان کی باتیں علم والی ہوتی ہیں۔ان کی کسی بات میں نہ تو کبھی شک کرنا اور نہ ہی بحث کرنا، وہ بھی نہ کرتا۔'' صفائی، ستھرائی، پاکیزگی کے راستے پہ پہلا قدم ہے، ایمان والے صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں''مولوی صاحب کا واعظ بعد از عصر جاری تھا۔''تو کیا یہ امیر لوگ جو اچھے اچھے صاف ستھرے اور قیمتی کپڑوں میں

ملبوس نظر آتے ہیں یہ سبھی ایمان والے ہوتے ہیں؟'' اس کا ذہن بار بار بھٹک رہا تھا۔ وہ محلے کے اس معزز شخص کی طرف دیکھتے ہوئے سوچے جا رہا تھا جو مولوی صاحب کی خدمت میں بڑے عاجزانہ انداز سے نذرانہ پیش کر رہا تھا۔ مولوی صاحب اسے دعائیں دیتے ہوئے دوسرے نمازیوں کو بھی اللہ کے گھر کی خدمت کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ اس معزز شخص کی اصلیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مولوی صاحب کو اس سے نذرانہ لینے سے منع کر دیتا۔ اس کی تو مولوی صاحب کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ نماز سے پہلے ہی ان کی چبھتی ہوئی نظروں سے خائف ہو گیا تھا۔ آج پھر وہ کام والے، میلے کپڑوں میں ہی آ گیا تھا نماز کا وقت قریب تھا اگر وہ کپڑے تبدیل کرتا تو یقیناً نماز قضا ہو جاتی۔ اس دن اس نے عہد کیا کہ آئندہ وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر ہی مسجد میں آئے گا۔ مولوی صاحب آج کل اس سے بہت خوش تھے۔ ''بس یوں ہی عمدہ کپڑوں میں نظر آیا کرو۔ صفائی نصف ایمان ہے۔ ٹرک چلانے کا یہ مقصد نہیں کہ تم صاف ستھرے نہیں رہ سکتے۔ صفائی تو نصف ایمان ہے بس تم یہ یاد رکھا کرو۔'' چند ماہ بعد وہ دوبارہ اپنے پرانے حلیے میں نظر آیا تو مولوی صاحب کا کوفت کے مارے برا حال ہو گیا اس کی سلام کا جواب اک ہنہ کی شکل میں آیا۔ ''مولوی صاحب اگر آپ کی بات مانتا ہوں تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں نصف کی جگہ پورا ایمان ہی نہ چلا جائے جب نوکری ہی نہیں ہوگی تو پھر کیا قائدے اور قانون۔ مذہب تو پیٹ بھرا ہو تو ہی یاد رہ سکتا ہے۔'' اس نے مولوی صاحب کے پیٹ پر نظر تو ضرور ڈالی پر ان کا احترام آڑے آیا اور وہ خود سے ہی سرگوشی کر سکا۔ اس کے مالک نے اسے دھمکی دی تھی اپنا حلیہ فوراً بدل ڈالے اور ہر وقت لاٹ صاحب بنا مالک کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا۔'' (الحمراء نومبر ۲۰۱۱ء)

رُوئیداد عرب (نور احمد شیخ)

سُنائیں کیا تمہیں عرب کا فسانہ
عرب اور عجم کا ہے قصہ پرانا
مگر تیل واں پہ کیا نکلا ہے یارو
شرافت ہوئی ہے عرب سے روانہ
سعودی عرب جس پہ رحمت خدا کی
بنا ہے تعیّش کا اک آستانہ
چلن فاخرانہ ۔ادا شاطرانہ
نزاکت کے انداز ہیں دلبرانہ
پلٹ جیسے آیا ہو دورِ جہالت
ہوا دین و ایماں کا رُخصت زمانہ
حسب اور نسب کی پرستش وہی ہے
ازل سے وہی چال آذرانہ
قوی تر کی پوجا ہے ایمان اُن کا
ہے سُلطانیت اُن کا قومی ترانہ
ہے امریکنوں پر عنایت کی بارش
ہیں انگریز بھی محرمِ راز خانہ
مگر پاک و ہند کے مسلماں
ہیں ارضِ حرم میں ستم کا نشانہ
بغلگیر غیروں سے اپنوں سے برہم!
زمانے کا ہے یہ دستور پرانا!
وہ کیا درسِ اسلام دیں گے جہاں کو
بُتوں سے جنہیں عشق ہے والہانہ
اُنہیں دیکھ کر کون لائے گا ایماں
نظر عامیانہ، ڈگر سوقیانہ
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
ٹٹولا تو جیسے لگا تازیانہ

(نوشتہ دیوار)

وہ بھی اب یاد کریں کس کو منانے نکلے

ہم بھی یوں ہی تو نہ مانے تھے سیانے نکلے

میں نے محسوس کیا جب بھی کہ گھر سے نکلا

اور بھی لوگ کئی کر کے بہانے نکلے

آج کی بات پہ میں ہنستا رہا ہنستا رہا

چوٹ تازہ جو لگی درد پرانے نکلے

دولت و حرص و ہوس جنس قفس خواب عبث

تم یہی سوچ کے پردیس کمانے نکلے

تیرے ارمان سے پیمان سے مل جانے تک

مری کتاب میں تو سب ہی فسانے نکلے

قتل کافر جو ہوا اتنی ریا رکھتا تھا

بند مٹھی سے بھی تسبیح کے دانے نکلے

عامر امیر